

پیامِ اقبال

بنام
نوجوانانِ ملت

مؤلف:

سید قاسم محمود



مکتبہ خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

نام کتاب _____ پیام اقبال بنام نوجوانانِ ملت
 اشاعت اول تا سوم (دسمبر 2003ء تا مئی 2012ء) _____ 3300
 اشاعت چہارم (اکتوبر 2016ء) _____ 1100
 ناشر _____ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
 مقام اشاعت _____ 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
 فون: 3-35869501
 مطبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
 قیمت _____ 200 روپے

email: publications@tanzeem.org
 website: www.tanzeem.org

فہرستِ مضامین

9..... پیامبرِ اقبال

سوانحِ اقبال (از ولادت 9 نومبر 1877ء تا وفات 21 اپریل 1938ء)

39..... پیامِ منظوم

اقبال کے اردو اور فارسی مجموعہ ہائے کلام کا تعارف

47..... پیامِ اقبال کا ارتقاء

تینوں تخلیقی ادوار میں اقبال کا مخاطب صرف ”نوجوان“ ہے

61..... خودی

خودی کا سر نہاں لا اِلہَ اِلَّا اللہ خودی ہے تیغِ فساں، لا اِلہَ اِلَّا اللہ

82..... فقر

اگر جواں ہوں، مری قوم کے جسور و غیور قلندری میری، کچھ کم سکندری سے نہیں

86..... عشق

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے

91..... عشقِ قرآن

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

94..... عشقِ رسولؐ

قوتِ عشق میں ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

مؤمن 113

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

شاہین 117

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

علم و عقل 120

یہ علم یہ حکمت یہ تدبیر یہ حکومت پتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

مغربی تعلیم 123

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

مغربی تہذیب 126

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اسلام: نشأۃ ثانیہ 131

اقبال کا ترانہ باغِ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا

دختر ان ملت 144

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

نونہا لالانِ ملت 147

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

ہیام پذیر یہ ہا وید اقبال 152

ایک عقلی لہجہ تھا نظام پیدا کر گیا زمانہ سے صبح و شام پیدا کر

کلامِ مکتوم 198

مکتوم کلام کے ہا وید اقبال اور مکتوم سے شاہکار لٹریچر پاروں کا انتخاب

تمہید و تعارف

جب ”سالِ قائد اعظم“ (2001ء) کے حوالے سے سرکاری سرگرمیوں کا اختتام ہونے لگا تو حکومت پاکستان نے 2002ء کو علامہ اقبال کے 125 ویں سالِ ولادت کی نسبت سے ”سالِ اقبال“ قرار دینے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان سنتے ہی ”مرکزی انجمن خدام القرآن“ کو خیال آیا کہ اس سال کے دوران میں ہونے والے علمی و تحقیقی کاموں میں ہمیں بھی شریک ہونا چاہئے، کیونکہ اس ”انجمن“ کو خدام القرآن ہونے کے باعث اقبال کے ساتھ ایک نسبت خاص ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور ”تنظیم اسلامی“ کی جانب سے شائع کردہ کتب یا مقالات میں تو اقبال کے شعروں کے بغیر سلسلہ کلام گویا ادھورا اور پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ تنظیم و انجمن کے مؤسس اور روح رواں کا کوئی بھی خطبہ، مقالہ، تقریر اور تحریر ایسی نہیں ہے جس کے متن کے جوہر میں روح اقبال شامل نہ کی گئی ہو۔ قرآن اور حدیث نبویؐ کے بعد ہمارے ہاں اقبال پر اس قدر اعتماد کرنے کی وجہ خود محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے الفاظ میں معلوم کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے 3 مئی 1974ء کو اچی سن کالج لاہور کے طلبہ سے جو معرکہ آراء خطاب فرمایا تھا، وہ ”علامہ اقبال اور ہم“ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا اور اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اس خطبے میں اقبال سے اہل پاکستان کی ذہنی و قلبی وابستگی کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا:

”میرے نزدیک پاکستان میں بننے والا ہر مسلمان قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے ہو اور بالکل ان پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ مرحوم کے ساتھ سہ گانہ و سہ گو نہ رشتوں میں منسلک ہے۔ ایک یہ کہ مملکت خداداد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزریں

ہیں اس کا وجود و قیام علامہ اقبال ہی کے تخیل و تصور کا رہین منت ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملتِ اسلامیہ اور اُمتِ مرحومہ جس سے ہم سب منسلک ہیں اس دور میں اُس کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں بھی اقبال ہے اور اس کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا خدی خواں بھی اقبال ہی ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ دینِ حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے امر اور موز کا سب سے بڑا ازداں بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روحِ باطنی اور جسدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال ہی کو حاصل ہے۔

یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ اقبال کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبال سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدیدِ ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ گویا ملتِ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور تشکیلِ جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبہٴ دینِ حق کی جدوجہد دونوں کا اصل منبع و مدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآنِ حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدیدی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہئے اور میں دیکھتا ہوں کہ ملتِ اسلامی اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے اس طرح قرآنِ حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر ملک اس سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ اقبال کو تھا۔“

علامہ اقبال سے ”مرکزی انجمن خدام القرآن“ کے اراکین کی اس خاص نسبت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”سال اقبال“ میں حسب استطاعت اپنا حصہ ڈالنے کا عزم کیا گیا۔ لہذا ہوا کہ ”ملاطین لہر“ کی طرح ”لدا لے طلاقت“ کی ایک خصوصی اجتماعت طیارہ مرحوم کے حوالے سے کسی ایسے اور مفرد موضوع کے لئے وقف کر دی جائے۔ اس موقع پر اسی لہر کا نام لیا گیا۔ علامہ عارف سعید صاحب مدیر

”ندائے خلافت“ سے مشورت کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ آج کا سب سے بڑا مسئلہ نوجوانانِ ملت کی تعلیم اور ان کی کردار سازی کا ہے کہ کروڑوں نفوس کا یہ قافلہ سخت جان جائے تو کدھر جائے۔ چنانچہ اس مسئلے اور موضوع پر ”نوجوانانِ ملت کے نام اقبال کا پیام“ یکجا کرنے کا کام شروع ہوا۔ علامہ صاحب کا تمام سرمایہ شعر و نثر کھنگالنے کی مہم نے ایک مقصد کی حیثیت اختیار کر لی۔ لاہور کے مختلف کتب خانوں میں موجود کتب و جرائد میں متعلقہ مواد کی مجموعی فہرست مرتب کرنے میں جناب محمد کبیر (ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی آف پاکستان) نے نہ صرف رہنمائی کی بلکہ ان مقالات کی فوٹو کاپیاں بھی فراہم کیں۔ اس لطف خاص کے لئے اُن کا شکر یہ ہم پر واجب ہے۔

”ندائے خلافت“ کا یہ خصوصی شمارہ دو رنگوں میں چھپا تھا۔ چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اربابِ فکر و دانش اور ماہرینِ اقبالیات نے اور اُن سے زیادہ نوجوان طلبہ و طالبات نے ہمارا یہ کام بہت پسند کیا یہاں تک کہ ہر گوشے سے یہ فرمائش آنے لگیں کہ اسے کتابی صورت میں بھی شائع کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ یہ کتاب انہی کی فرمائش پر پیش ہے۔ معلوم ہوا کہ ”اقبال اکیڈمی آف پاکستان“ نے اس کتاب کو پسند کرتے ہوئے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کرایا ہے اور عنقریب وہ بھی ان کے زیرِ اہتمام کتابی صورت میں چھپنے والا ہے۔

”پیامِ اقبال“ پہلے ”ندائے خلافت“ کی خصوصی اشاعت کے تحت اور پھر کتابی صورت میں شائع کر دینا ”مرکزی انجمن خدام القرآن“ کی ذمہ داری تھی۔ وہ اُس نے بخوبی پوری کر دی۔ اس کو پھیلانا اور ایک ایک طالب علم تک پہنچانا ”نوجوانانِ ملت“ کی ذمہ داری ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری نبھانے میں سرخرو ہوں گے۔

بیابہ مجلس اقبال و یک دو ساغرکش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

پیامبر اقبال

یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کا آٹھواں عشرہ بڑا ہی مردم خیز تھا۔ لینن (1870ء)، فلسفی برٹنڈ رسل (1873ء)، چرچل اور ناول نگار سمرسٹ ماہم (1874ء)، امریکی ناول نویس تھامس مان (1875ء)، رضا شاہ اول (1876ء)، جرمنی کا چانسلر ایڈی نار (1877ء)، علامہ محمد اقبال (1877ء)، مولانا محمد علی جوہر، کمال اتاترک اور قائد اعظم (1876ء)، روسی سیاست دان ٹراٹسکی، شالن اور سائنس دان آئن سٹائن (1879ء) سب اسی عشرے کی پیداوار ہیں۔ گویا قدرت دنیا کے مختلف گوشوں اور شعبوں میں جو انقلاب لانا چاہتی تھی، اُس کی داغ بیل اسی عشرے میں ڈالی گئی۔

خاندانی پس منظر

علامہ اقبال کے اجداد ہندو برہمن تھے۔ مغلوں کے دور حکومت میں کشمیر میں بے شمار صوفیائے کرام باہر سے تشریف لائے، جنہوں نے اپنے اعلیٰ کردار اور حسن سلوک سے مقامی ہندو آبادی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ جوق در جوق اسلام قبول کر کے ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے لگے تھے۔ 1650ء کے لگ بھگ سری نگر میں ایک سید درویش وارد ہوئے۔ علامہ اقبال کے جد امجد بھی اُن کی زیارت کے لئے سری نگر آئے۔ اس مردِ قلندر کی نگاہ کام کر گئی اور انہوں نے اس درویش کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کا نام صالح رکھا گیا اور وہ بعد ازاں ”بابا صالح“ کے نام سے مشہور ہوئے۔ سید درویش نے ان کے تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنی دختر نیک اختر کا نکاح بھی ان سے کر دیا۔ علامہ اقبال نے اپنے خاندانی پس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

میں اصل کا خاص سوماتی آبا مرے لاتی و مناتی

علامہ اقبال کے جد شیخ محمد رفیق کی پہلی شادی سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے دس لڑکے پیدا ہوئے، لیکن سب ایک ایک کر کے داغ مفارقت دے گئے۔ شیخ نور محمد (علامہ اقبال کے والد) گیارہویں اولاد تھے۔

شیخ نور محمد کو اپنے خاندان میں ”میاں جی“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ پہلے انہوں نے گزر اوقات کے لئے بچوں کے کرتے بنانے شروع کئے۔ پھر جب سیالکوٹ میں ایک ڈپٹی وزیر علی بلگرامی قیام پذیر ہوئے تو شیخ نور محمد نے ان کے ہاں کپڑے سینے کی ملازمت اختیار کر لی۔ بلگرامی نے شیخ صاحب کو ”سنگر“ مشین خرید کر دی جو اس زمانے میں ایک نادر چیز سمجھی جاتی تھی۔ بلگرامی کی ملازمت میں خاصی بچت ہو جاتی تھی، لیکن اقبال کی والدہ امام بی بی گھر میں ان کی تنخواہ کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتی تھیں۔ ان کے خیال میں بلگرامی کی آمدنی حلال نہیں تھی۔ اپنی تنخواہ کی پذیرائی کا حال دیکھا تو شیخ نور محمد نے ملازمت چھوڑنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ ان کا نیا کاروبار ٹوپیوں کا تھا۔ اس کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ انہیں گاہکوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے کئی ملازم رکھنے پڑے۔ بعد میں جب ان کی عمر زیادہ ہو گئی تو انہوں نے یہ کام اپنے داماد غلام محمد کے حوالے کیا، جس کی لا پرواہی سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی خاندان میں ”بے جی“ کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں، لیکن صوم و صلوة کی بڑی پابند تھیں۔ حسن سلوک کے باعث سارا محلہ ان کا گردیدہ تھا۔ ان کی دیانت داری کا یہ حال تھا کہ محلے کی اکثر عورتیں آپ کے پاس زیورات نقدی اور دیگر قیمتی اشیاء بطور امانت رکھتی تھیں۔ محلے یا برادری میں لوگوں میں آپس میں کبھی ٹوٹکار ہو جاتی تو ”بے جی“ کو ثالث مقرر کیا

جاتا۔ وہ غریب عورتوں کی خفیہ امداد بھی کرتی رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوا کہ وہ غریب والدین کی بچیاں اپنے گھر لے آئیں اور انہیں بڑے ناز اور چاؤ سے پالا پوسا اور جب وہ جوان ہو گئیں تو ان کی شادی کرادی۔

شیخ نور محمد کو تصوف کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ پھر بچپن ہی سے اہل دین کی صحبتوں نے اس ذوق کو شوق کی حد تک بڑھا دیا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ تصوف کے معاملات و مسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی بناء پر انہیں ”ان پڑھ فلسفی“ کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کی عادات و اطوار اور مشاغل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اول و آخر صوفی تھے اور خوفِ خدا انہیں ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔ ”رموزِ بے خودی“ میں اقبال نے اپنے والد محترم کی خدا ترسی کا حال منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بار کسی فقیر نے بھیک مانگنے کے لئے ان کے دروازے پر صدا لگائی اور کچھ لئے بغیر وہاں سے کسی طرح نہ ٹلا۔ نوجوان اقبال کو اس بات پر سخت غصہ آیا اور انہوں نے اسے دو چار طمانچے رسید کر دیئے۔ اس سے فقیر کی جھولی میں جو کچھ تھا، وہ سب زمین پر گر پڑا۔ ان کے والد نے یہ منظر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں اپنے بیٹے اقبال سے کہا:

”قیامت کے دن جب رسول کریم ﷺ کے ارد گرد ساری امت مسلمہ جمع ہوگی، غازی، شہید، عالم، حافظ، عابد سب موجود ہوں گے اور یہ مظلوم فقیر آقائے نامدار کے سامنے تمہارے اس ظلم کی فریاد کرے گا، اور آنحضرت ﷺ مجھ سے پوچھیں گے کہ ہم نے ایک بندہ مسلم کو تیری فرزندگی اور نگہداشت میں دیا، تو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اے نورِ نظر! تو امتِ محمدی کا ایک فرد ہے۔ تجھے اخلاقِ محمدی سے بہرہ ور ہونا چاہئے اور سراپا شفقت و رحمت بنا چاہئے نہ کہ ظلم و فرعونیت کا نمونہ۔“

اقبال کے دل پر اپنے والد محترم کی یہ نصیحت اثر کر گئی، بلکہ ان کے دل و دماغ پر ایک دائمی نقش چھوڑ گئی۔

شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے کا نام شیخ عطا محمد اور چھوٹے لڑکے کا نام محمد اقبال تھا۔ شیخ عطا محمد نے ابھی میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا کہ

ان کی شادی برٹش انڈین آرمی کے ایک ریٹائرڈ پنشنر سپاہی کی لڑکی سے ہو گئی۔ خسر کے اثر و رسوخ کی وجہ سے شیخ عطا محمد کو پہلے فوج میں ”رسالہ“ میں ملازمت مل گئی۔ پھر بعد میں انہیں رڑکی کے انجینئرنگ سکول میں داخلہ مل گیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد وہ فوج میں اوورسیئر بن گئے اور ترقی کرتے کرتے ایس ڈی او بن گئے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران مختلف مقامات پر متعین رہے اور کچھ عرصہ ایم ای ایس ایبٹ آباد میں بھی گزارا۔ اس ملازمت میں انہوں نے کافی روپیہ بچایا۔ اقبال کی اعلیٰ تعلیم کا خرچہ بھی انہوں نے ہی برداشت کیا۔ بعد ازاں اُن کا میلان قادیانیت کی طرف ہو گیا۔ شیخ عطا محمد کے دو فرزند تھے: شیخ اعجاز احمد اور شیخ مختار احمد۔ شیخ عطا محمد کا انتقال 1940ء میں ہوا۔

اقبال کے والد محترم شیخ نور محمد کا انتقال 17 اگست 1930ء کو ہوا۔ والدہ محترمہ امام بی بی 9 نومبر 1914ء کو 78 سال کی عمر میں رحلت فرما گئیں۔ وہ اقبال سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اقبال بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گرمیوں میں عدالتیں بند ہوتیں تو وہ انہیں ملنے کے لئے سیالکوٹ تشریف لے جاتے۔ وہ بھی اُن کے خط کا بڑی بے تابی سے انتظار کیا کرتیں۔ جب اقبال اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ان کی بخیریت وطن واپسی کے لئے دعا مانگا کرتیں۔ اقبال نے اپنی شخصیت پر والدہ کے اثرات کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اس کا اندازہ اُن کے اس مرثیے سے ہوتا ہے جو انہوں نے والدہ کی وفات پر لکھا اور بعد میں ”والدہ مرحومہ کی یاد میں“ کے عنوان سے ”بانگِ درا“ کے اوراق میں شامل ہوا۔

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ! میرا انتظار؟
 کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
 خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
 اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
 تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
 گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

مولانا عبدالجید سالک جب تعزیت کے لئے علامہ اقبال کے پاس گئے تو وہ دیر
تک اپنی والدہ کی خوبیاں بیان کرتے رہے اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے تھے۔
فرمانے لگے: ”جب میں سیالکوٹ جاتا اور والدہ شگفتہ دلی سے فرماتیں ”میرا بالی آ
گیا“ تو میں ان کے سامنے خود کو ایک ننھا منا بچہ محسوس کرنے لگتا۔“

پیدائش اور بچپن

اقبال 9 نومبر 1877ء بمطابق 3 ذی قعدہ 1294ھ کو سیالکوٹ کے محلہ
چودھری وہاب میں (جسے آج کل اقبال سٹریٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے) پیدا
ہوئے۔ نومولود کا نام اُس کی والدہ نے ”محمد اقبال“ رکھا۔ اقبال ابھی دو سال کے تھے
کہ کسی بیماری میں جو نکلیں لگانے کا علاج تجویز کیا گیا۔ کپٹی پر جو نکلیں لگانے سے داہنی
آنکھ سے کافی مقدار میں خون خارج ہو گیا جس کی وجہ سے داہنی آنکھ کی بصارت
ہمیشہ کے لئے جاتی رہی۔ لیکن بائیں آنکھ کی بینائی اس قدر تیز تھی کہ انہیں آخری عمر
تک کبھی دائیں آنکھ کی بصارت چلے جانے کا احساس نہ ہوا۔ آخری بیماری میں جب
صحت مند بائیں آنکھ میں موتیا تر آیا تو انہیں اُس وقت محسوس ہوا کہ اُن کی ایک آنکھ
پہلے ہی سے ناکارہ ہے۔

ابتدائی تعلیم قدیم اور روایتی طرز کے مکتب میں حاصل کی۔ پہلے انہیں مولانا غلام
حسن کے مکتب میں بٹھایا گیا۔ بعد ازاں مولوی میر حسن کے مکتب میں درس لینے کے بعد
انہی کے مشورے پر انہیں سیالکوٹ کے سکاچ مشن سکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں
سے پانچویں جماعت کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کرنے پر وظیفہ ملا۔ 1891ء
میں مڈل اور 1893ء میں میٹرک پاس کیا۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ

سکول میں دیر سے آنے پر ماسٹر صاحب نے باز پرس کی تو آپ نے بے ساختہ جواب دیا: ”اقبال دیر ہی میں آتا ہے۔“

ایک دفعہ اقبال اپنے استاد محترم مولوی میر حسن کے گھر کے لئے بازار سے سودا سلف خرید کر واپس آئے تو راستے میں میر حسن صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اقبال کو دیکھتے ہی کہا ”تمہیں کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ بازار سے ہمارے لئے سودا سلف نہ لایا کرو۔ تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں۔“

اس پر اقبال نے مسکرا کر جواب دیا: ”جناب‘ میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔“

اقبال نے سکاچ مشن کالج (مرے کالج) سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ یہیں سے ایف اے کیا۔ انہوں نے جس ماحول میں تعلیمی مراحل طے کئے، اس کی ایک جھلک اقبال کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

”جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ والد صاحب اپنے درو دو وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک صبح وہ میرے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔“ بالآخر انہوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی۔ ایک دن صبح جب میں حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا: ”بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اتر رہا ہے، یعنی جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔“

لاہور میں آمد

اُن دنوں سکاچ مشن کالج، سیالکوٹ میں بی اے کی کلاسوں کا اجراء نہیں ہوا تھا (اس وقت تک وہ ”مرے کالج“ کے نام سے منسوب نہیں ہوا تھا)۔ چنانچہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ 1897ء میں بی اے کا امتحان سینڈ ڈویژن میں پاس کیا اور عربی میں اول آنے پر وظیفے کے علاوہ سونے کے دو تمغے بھی حاصل کئے۔ اسی سال انہوں نے ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا، جہاں انہیں سر نامس آرنلڈ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ آرنلڈ لاہور آنے سے پہلے علی گڑھ میں دس

سال تک فلسفہ پڑھا چکے تھے اور اس دوران میں انہوں نے مولانا شبلی سے عربی کی تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔ جب آرنلڈ ہندوستان چھوڑ کر لندن روانہ ہوئے تو اقبال نے ایک نظم ”نالہ فراق“ بطور یادگار لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

جا بسا مغرب میں آخراے مکاں تیرا مکیں! آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمین
کشہ عزلت ہوں آبادی میں گھبراتا ہوں میں شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیائی صحرائے علم تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
کھول دے گا دستِ وحشت عقدہ تقدیر کو توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدہ حیراں تری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گر دیدہ تقریر کو؟

1899ء میں یعنی سرسید کے انتقال سے ایک برس بعد اقبال نے ایم اے پاس

کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے پر نواب علی بخش گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اب وہ اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے ریڈر مقرر ہوئے۔ تنخواہ 73 روپے ماہوار تھی۔ آپ بھائی گیٹ کے قریب رہتے تھے۔ انہی ایام میں علی بخش جیسا جاں نثار ملازم ملا جس نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ بعد ازاں آپ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی اسٹنٹ پروفیسری مل گئی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ انگریزی بھی پڑھانے لگے۔ یہ ملازمت 2 ستمبر 1905ء تک رہی۔ اس کے بعد آپ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے کالج سے چھٹی لے لی اور یوں پڑھانے کا یہ سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا۔

شاعری کا آغاز

اقبال نے سیالکوٹ کے سکاچ مشن کالج کی طالب علمی کے زمانے میں شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ پہلے پنجابی میں شعر کہتے رہے۔ پھر مولوی میر حسن کے مشورے پر اردو میں کہنے لگے۔ سیالکوٹ میں ہونے والے اردو مشاعروں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ شاعری کی طرف اقبال کے رجحان کے پس منظر میں میر حسن کی ذات نظر آتی ہے جو خود بھی اردو اور فارسی شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ مولانا میر حسن نے اقبال

کو گلستان، بوستان، سکندر نامہ، انوار سہیلی اور سہ نثر ظہوری کا درس دیا تھا، چنانچہ لڑکپن میں اقبال کے ذہن سے کلام موزوں نکلے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

جب اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو ان کا یہ شوق پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ اب وہ بذریعہ خط و کتابت داغ کے شاگرد بن گئے اور انہیں اپنی غزلیں بغرض اصلاح بھیجنے لگے۔ ان دنوں داغ دہلوی حیدرآباد دکن کے دربار سے منسلک تھے۔ چند غزلوں میں معمولی سی اصلاح کے بعد داغ نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ ان کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔

داغ دہلوی کے علاوہ اقبال نے لاہور کے ایک ممتاز شاعر ارشد گورگانی سے بھی اصلاح لی۔ علاوہ ازیں اقبال لاہور کے مشاعروں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے۔ یہ مشاعرے بازار حکیمان (اندرون بھائی گیٹ) میں ”انجمن مشاعرہ اتحاد“ کے زیر اہتمام منعقد ہوتے تھے۔ ان کے اس شعر نے پہلی مرتبہ مشاعرے کے سامعین کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ایک اور مشاعرے میں اقبال کا کلام سن کر مولانا شبلی نعمانی نے کہا: ”جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔“

اقبال کے پیام کو عوام تک پہنچانے میں ”انجمن حمایت اسلام“ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انجمن ہی کے پلیٹ فارم سے اقبال نے اپنی پہلی نظم ”نالہ یتیم“ سنائی تھی جس سے حاضرین ششدر رہ گئے تھے۔

یورپ کا سفر

یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال علامہ اقبال کے ذہن میں کس طرح آیا؟ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ دراصل کئی عوامل مل کر فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ ایک واقعہ تو ان کا ”ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر“ کے لئے مقابلے کے امتحان میں

بیٹھنا تھا۔ یہ امتحان 1901ء میں ہوا تھا۔ امید تھی کہ اقبال اس میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہو جائیں گے، لیکن میڈیکل بورڈ نے دائیں آنکھ کے نقص کی بنیاد پر ”غیر موزوں“ قرار دے دیا۔ اس کھلی دھاندلی پر خوب شور مچا۔ منشی محمد دین فوق اور منشی محبوب عالم (مدیر ”پیہ اخبار“) نے بہت احتجاج کیا، لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ شاید اسی واقعے سے دل برداشتہ ہو کر اقبال نے یورپ جانے کا فیصلہ کیا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے سے خاصی دلچسپی تھی۔ لاہور کے ”لائسکول“ سے آپ نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن قانونی پیچیدگیاں حائل ہو گئیں۔ جب آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد پر حکومت کے بعض افسروں نے جھوٹا مقدمہ چلایا، تو آپ کا یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا ہوگا کہ انہیں قانون کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہئے۔

یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اپنے محبوب استاد سر ٹامس آرنلڈ کے لندن واپس چلے جانے سے اور بھی زیادہ شدید ہو گئی تھی۔ غالباً انہوں نے بھی اپنے لائق شاگرد کو انگلستان آنے کی دعوت دی ہوگی۔ اس وقت تک آپ نے اپنی ملازمت سے کچھ رقم پس انداز کر لی تھی، لیکن بیشتر اخراجات آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے برداشت کئے۔ اقبال نے ملازمت سے ”بغیر تنخواہ“ طویل چھٹی لی۔ اس وقت شیخ عطا محمد ایم ای ایس ایبٹ آباد میں ملازم تھے۔ چنانچہ جب یورپ جانے کے لئے تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اقبال اپنے بھائی سے ملنے ایبٹ آباد گئے۔ ایبٹ آباد میں شام کے وقت آپ باغ کی سیر کو نکلے اور جہاں اب میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے، اس کے سامنے کھڑے ہو کر کوہ سربن سے اٹھنے والی گھٹا اور پل بھر میں بارش برسنے کا دلفریب منظر دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر لظم ”ابر“ لکھی جو ”بانگ درا“ میں شامل ہے۔

اٹھی پھر آج وہ یورپ سے کالی کالی گھٹا سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا عجیب میکدہ بے خروش ہے یہ گھٹا
جو پھول مہر کی گرمی سے سوچے تھے اٹھے زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے

ہوا کے زور سے ابھرا بڑھا اڑا بادل اٹھی وہ اور گھٹا لو! برس پڑا بادل
ایک دو دن ایبٹ آباد میں قیام کے بعد واپس لاہور آ گئے۔ پھر دہلی گئے۔ وہاں
خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر گئے اور ”التجائے مسافر“ کے عنوان سے اپنا الوداعی
سلام پیش کیا۔ امیر خسرو اور غالب کے مزار پر بھی حاضری دی۔ ”التجائے مسافر“ کے
چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر تری جناب سے ایسی طے فغاں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جسیں کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے! یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے!

اس دعا میں اقبال کے آئندہ ذہنی سفر کی منزلوں کے نشان صاف طور پر دکھائی
دے رہے ہیں۔ ”یوسفِ ثانی“ اپنے بھائی شیخ عطا محمد کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے
چھوٹے بھائی کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اقبال یورپ میں

انگلستان پہنچنے کے بعد اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ سے اپنی اس خواہش کا اظہار
کیا کہ ان کا قیام کسی ایسے گھر میں کر دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ
میں یہودیوں کے ہاں ہی اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک
یہودی عورت کے ہاں جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی، قیام کیا۔ اس عورت
کے ہاں قیام کے دوران ان کی یہ عادت تھی کہ وہ رفعِ حاجت کے لئے لوٹا ساتھ لے
جاتے تھے۔ مالکہ مکان نے ایک دن پوچھا کہ تم غسل خانے میں لوٹا کیوں ساتھ لے
جاتے ہو۔ آپ نے فرمایا: ”اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت
کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں، بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی
ضروری ہے۔“ اس سلسلے میں مزید گفتگو کے دوران انہوں نے طہارت کے اسلامی

اصول بیان کئے۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ غسلِ جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اس طرح فرض ہے کہ جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔ پھر آپ نے اس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”بڑی بی بی“ آپ کو اس طرح کے کسی غسل کی حاجت نہ ہوگی، البتہ طہارت کے لئے پانی ضرور استعمال کیجئے۔“ یہ باتیں سن کر بڑی بی بی بہت خوش ہوئیں اور اسلامی قاعدے سے طہارت کرنے کا وعدہ کر لیا۔

1905ء میں اقبال نے کیسبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن کے لاء کالج ”لنکن ان“ میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسی دوران میں آپ نے میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لئے ”فلسفہ عجم“ پر مقالہ لکھنے کا آغاز کر دیا۔ آپ نے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھا۔ 28 اگست 1907ء کو میونخ پہنچے۔ وہاں پروفیسر ران کی حسین اور طرح دار بیٹی ان کی معلم اور اتالیق رہی۔ 30 اگست کو آپ ہائیڈل برگ میں مقیم ہو گئے (چنانچہ اب وہاں ایک تختی نصب کی گئی ہے جس میں اقبال کا نام اور ان کے قیام کی تاریخیں درج ہیں)۔ 4 نومبر 1907ء کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن واپس آئے اور ”لنکن ان“ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ معاشیات اور سیاسیات کے مطالعے کے لئے ”لندن سکول آف اکنامکس“ میں داخلہ لیا اور کیسبرج یونیورسٹی سے ”فلسفہ اخلاق“ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈگری بھی حاصل کی۔

قیام یورپ کا زمانہ اقبال کی ذہنی نشوونما میں ایک نہایت اہم دور قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس دور میں اقبال کے تخیلات میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں اور انہوں نے اپنے لئے ایک منزل کا تعین کیا۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انگلستان کی مادی خوشحالی سے پیدا ہونے والی لادینیت اور بے راہ روی نے اقبال پر الٹا اثر کیا اور یوں اسلامی تعلیمات و معاملات اور شعائر میں ان کا شغف پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ قیام یورپ کے زمانے کی جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، اس کے

لئے ہم اقبال کی ایک خاتون دانشور دوست بیگم عطیہ فیضی کے مرہون منت ہیں جن کے ساتھ علامہ کی انگلستان اور جرمنی میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی دعوت پر وہ کچھ عرصہ جرمنی میں بھی رہیں اور پھر واپس ہندوستان لوٹ آئیں۔

مئی 1908ء میں لندن کے کیکسٹن ہال میں جسٹس سید امیر علی کے زیر صدارت مسلمانان لندن کا اجلاس ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی لندن شاخ کا افتتاح ہوا۔ سید امیر علی صدر اور اقبال مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں اسلام اور اسلامی فلسفے پر نصف درجن مقالات لکھے۔ ”پان اسلامک سوسائٹی“ کی تنظیم میں حصہ لیا۔ انگلستان، سکاٹ لینڈ اور جرمنی کے مختلف علاقوں کے دورے کئے۔ لندن میں اسلام پر کئی لیکچر دیئے۔ پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے کے دوران عجیبی تصوف کا تحقیقی مطالعہ کیا جس سے نظریہ وحدت الوجود کا طلسم پاش پاش ہو گیا۔ وطنیت کا جو تصور یورپی اقوام میں رائج تھا اقبال نے اس کا بھی بغور مشاہدہ کیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطنیت خود ایک بت ہے اور اسے توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

قیام یورپ کے دوران میں عملی جدوجہد کی بریکٹس کچھ اس طرح روشن ہوئیں کہ اقبال نے شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن شیخ عبدالقادر اور سر آرنلڈ کے اصرار پر یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں جو دوسری اہم تبدیلی واقع ہوئی وہ فارسی کو اپنے اظہار کے لئے برتنا تھا۔ اب اقبال نے زیادہ تر فارسی ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ قیام یورپ کے آخری ایام میں پروفیسر آرنلڈ کی رخصت کے دوران چھ ماہ تک لندن میں عربی کے پروفیسر رہے اور تین برس کے قیام کے بعد متعدد ڈگریوں کے ساتھ واپس وطن لوٹے۔

یورپ سے واپسی

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال پہلے بمبئی میں اپنے دوستوں سے ملے۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء امیر خسرو اور غالب کے مزار پر دوبارہ حاضری دی اور انبالہ میں احباب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد 27 جولائی

1908ء بروز دو شنبہ دوپہر کی ریل گاڑی سے لاہور پہنچے۔ دوست اور عقیدت مند اپنی معیت میں بھائی دروازے لے گئے، جہاں باغ میں شامیانے نصب کر کے چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر آپ اسی دن سیالکوٹ اپنے والدین سے ملنے چلے گئے۔

تین چار روز کے بعد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد لاہور آئے اور مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ذمہ ایک دفتر کرائے پر لینے کا کام سونپ گئے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے موہن لال روڈ (اردو بازار) پر نشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے سامنے ایک مکان کرائے پر لیا۔ بڑے بھائی اور بعض احباب کا اصرار یہ تھا کہ اقبال ضلع کچہری میں وکالت کریں، لیکن خود اقبال نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ دو تین ماہ کے بعد انہوں نے یہ مکان چھوڑ کر انارکلی بازار کا وہ بالا خانہ کرائے پر حاصل کر لیا، جس میں اس سے پہلے سر محمد شفیع بھی کافی عرصے تک قیام کر چکے تھے۔ اس مکان میں دفتر بھی تھا اور سکونت بھی۔

وکالت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج میں ڈیڑھ سال تک ایم اے کو فلسفہ اور بی اے کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ وکالت کے زمانے میں علامہ اقبال کے نشی ”نشی طاہر الدین“ تھے (یہ وہی صاحب ہیں جن کی ایجاد کردہ دوا ”دل روز“ کافی مقبول ہوئی)۔ بحیثیت وکیل اقبال نے 1908ء سے 1934ء تک کام کیا۔ ان کی دوسری دلچسپیاں کچھ ایسی تھیں کہ وہ اپنی پوری توجہ قانون کے پیشے کو نہ دے سکے، چنانچہ اس میں کوئی خاص شہرت ان کے حصے میں نہ آئی۔

1917ء میں سراجہ حیدری نے قانون کی پروفیسری کے لئے حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور لکھا کہ آپ کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت ہوگی، لیکن آپ نے یہ ملازمت قبول نہ کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی آپ کو پروفیسری کی پیشکش کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی تاریخ کی پروفیسری کی پیشکش ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں بحیثیت پرنسپل تقرری کی تجویز پیش ہوئی۔ لیکن آپ نے یہ تمام ملازمتیں

قبول نہیں کیں۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال اظہار رائے کی آزادی کو کسی بھی قیمت پر قربان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ زندگی کو اپنے نصب العین کی روشنی میں ایک خاص ڈھب سے گزارنے کے لئے انہوں نے چند اصول بنائے ہوئے تھے جن پر عمل کرنے کو وہ ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے۔

دوسری گول میز کانفرنس

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لئے دوسری گول میز کانفرنس کا اعلان کیا جو دسمبر 1931ء میں لندن میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، سر آغا خان، محمد علی جناح اور علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا۔ انہی ایام میں علامہ اقبال کو مزید دو دعوتیں موصول ہوئیں۔ پہلی دعوت روم اکیڈمی کی طرف سے تھی۔ مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے عالم اسلام کے اتحاد کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور تمام اسلامی ممالک کے نمائندوں کو بیت المقدس آ کر تبادلہ خیال کی دعوت دی۔ علامہ اقبال کو بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔

علامہ اقبال 8 اگست 1931ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے جہاں کوئی تین ہزار افراد آپ کے انتظار میں جمع تھے۔ جونہی گاڑی رکی اور آپ اپنے ڈبے سے باہر نکلے، ہجوم نے نعرہ بکسیر بلند کیا اور پھولوں کی بارش شروع کر دی۔ آپ نے مختصر سا خطاب کرتے ہوئے کہا:

”میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں۔ میرے ساتھ حق و صداقت کی ایک جامع کتاب ”قرآن مجید“ ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔“

20 اگست کو پورٹ سعید پہنچے۔ عدن کی بندرگاہ پر ساحل عرب کو دیکھ کر آپ پر عجیب و غریب جذباتی کیفیت طاری ہو گئی اور سرزمین عرب کو مخاطب کرتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے:

”اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا جادو کیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی..... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا سکوں، جس کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔“

27 اگست 1931ء کو اقبال انگلستان پہنچے اور اپنے سات سالہ فرزند جاوید

اقبال کو بذریعہ تاریخیت سے لندن پہنچنے کی اطلاع بھیجی۔ اس اثنا میں مولانا غلام رسول مہر یورپ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ 18 نومبر کو لندن کی ”اقبال لٹریٹری ایسوسی ایشن“ نے علامہ اقبال کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں ہندوستان اور انگلستان کی منتخب علمی و سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ لفظ ”پاکستان“ کے خالق چوہدری رحمت علی بھی شریک محفل تھے۔ اقبال کی تصنیف ”اسرارِ خودی“ کے انگریز مترجم اور علامہ اقبال کو یورپ کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے والے پروفیسر نکلسن بھی موجود تھے۔ سروجنی ٹائیڈ و بھی حاضر تھیں۔ صدارت کے فرائض سر شیخ عبدالقادر نے انجام دیئے۔

گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں اقبال کو اپنے فرزند جاوید اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط موصول ہوا، جس میں انہوں نے اپنے والد سے گراموفون لانے کی فرمائش کی تھی۔ گراموفون تو خیر وہ نہ لائے، البتہ خط کے جواب میں ایک غزل لکھ کر بھیج دی جو ”بانگِ درا“ میں ”جاوید کے نام“ کے عنوان سے شامل ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر! نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر!
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر!
 میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!
 مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بچ غریبی میں نام پیدا کر!
 انگلستان سے واپسی میں اٹلی کی حکومت کی دعوت پر روم گئے۔ مولانا غلام رسول
 مہر علامہ صاحب کی معیت میں تھے۔ معلوم ہوا کہ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان
 غازی بھی روم میں مقیم ہیں۔ چنانچہ کوئی تین گھنٹے تک ملاقات ہوئی، جس میں انگلستان
 اور عالمِ اسلام کا مستقبل خاص طور پر زیر بحث رہا۔

27 نومبر کو مسولینی کی خواہش پر علامہ اقبال نے اس سے ملاقات کی۔ رسی مزاج
 پُرسی کے بعد مسولینی نے علامہ سے پوچھا: ”میری فاشٹ تحریک کے بارے میں آپ
 کا کیا خیال ہے؟“

علامہ اقبال نے جواب دیا: ”آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنایا ہے
 جسے اسلام اپنے نظامِ حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کا
 نظریہ حیات پوری طرح اپنالیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو سکتا ہے۔“
 مسولینی نے علامہ سے اٹلی کے قیام کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے۔
 آپ نے فرمایا: ”میں اطالویوں کے متعلق سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے کافی مشابہت
 رکھتے ہیں اور بڑے ذہین و فطین، خوبصورت اور فن پرست ہیں۔ ان کے پیچھے تمدن کی
 کتنی ہی صدیاں ہیں، مگر ان میں خون نہیں۔“

مسولینی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:
 ”ایرانیوں کو ایک فائدہ میسر رہا ہے جو اطالویوں کو میسر نہیں، اور وہ یہ کہ ان کے اردگرد
 مضبوط اور توانا قومیں افغان، کرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کر سکتے
 ہیں۔ آپ اطالوی ایسا نہیں کر سکتے۔“

اس پر مسولینی نے پوچھا: ”اچھا، ہم اہلِ اٹلی کو کیا کرنا چاہئے؟“
 علامہ اقبال نے جواب دیا: ”یورپ کی تقلید سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو، اس

لئے کہ یورپ کا اخلاق ٹھیک نہیں۔ مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لو۔“
 مسولینی نے علامہ اقبال سے کوئی اچھوتا مشورہ طلب کیا جو خاص اٹلی کے حالات
 کے لئے موزوں ہو۔ انہوں نے فرمایا: ”ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے ایک خاص حد
 سے آگے بڑھنے نہ دو۔ اس سے زیادہ آبادی کے لئے نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔“
 مسولینی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: ”شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے
 اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی بھی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکاتِ شر
 لے لیتے ہیں۔“ علامہ اقبال نے مزید کہا:

”یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے رسولؐ نے تیرہ سو سال پہلے یہ مصلحت آمیز
 ہدایت جاری فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید
 لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔“
 یہ حدیث مبارکہ سنتے ہی مسولینی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ میز پر زور
 سے مارتے ہوئے کہنے لگا: ”کتنا خوبصورت خیال ہے!“

علامہ اقبال نے ”مسولینی“ کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی تھی، جس کے چند

اشعار یہ ہیں۔ ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
 ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
 چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
 نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
 یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا، یہ نمود!
 فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
 نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
 زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
 فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
 وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد جب مسولینی نے جیشہ پر چڑھائی کر دی تو آپ نے مسولینی کی جوع الارض کی حرص کی سخت مذمت کی۔ 18 اگست 1935ء کو ایک نظم ”ابی سینیا“ کے عنوان سے لکھی جو ضرب کلیم میں شامل ہے۔۔

یورپ کے کرسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے بڑا معصوم کی تلاش!

اے وائے آبروئے کلیسا کا آمنہ
رومانے کر دیا سر بازار پاش پاش!
پیر کلیسیا! یہ حقیقت ہے دل خراش!

ایک دفعہ کسی نے علامہ اقبال کو لکھا کہ آپ نے مسولینی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اس کی کیا وجہ ہے! اس پر آپ نے مختصر سا جواب دیا: ”اگر اس بندہ خدا میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے؟“

اٹلی میں دورانِ قیام ایک روز علامہ اقبال مولانا غلام رسول مہر کی معیت میں کولوسیم کے آثار قدیمہ دیکھنے گئے۔ ایک ماہر نے بتایا کہ روم کے ان اکھاڑوں میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت تماشا دیکھ سکتے تھے۔ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد مہر صاحب سے کہنے لگے:

”ایک طرف قدیم رومی شہنشاہ تھے جنہوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض کے لئے بنائی کہ پچاس ہزار انسان بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا

تماشہ دیکھ سکیں۔ دوسری طرف لاہور کی بادشاہی مسجد ہے جو اس غرض سے تعمیر کی گئی ہے کہ ایک لاکھ بندگانِ خدا جمع ہو کر مساوات، اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کتنی برکات کا سرچشمہ ہے۔“

28 نومبر کو آپ نے نیپلز کے کھنڈرات کی سیر کی اور عجائب گھر دیکھا۔

29 نومبر کو مصر کے لئے روانہ ہو گئے۔

اقبال مصر میں

قاہرہ میں آپ کی رہائش کا انتظام میٹروپولیٹن ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبد الحمید سعید بے نے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس موقع پر مصری اخبار نویسوں نے آپ کو مجبور کر دیا کہ مصری نوجوانوں کی تنظیم ”شبانِ مصر“ کے نام کوئی مختصر پیغام ضرور جاری کریں۔ چنانچہ آپ نے ایک کاغذ پر اپنا یہ پیغام لکھ دیا: ”مصر کے نوجوانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کے وفادار رہیں۔“

ایک روز مصر کی بزرگ شخصیت سید محمد قاضی ابوالعزائم اپنے دونوں بیٹوں کی معیت میں علامہ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ علامہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آپ کی زیارت کے لئے آپ کے پاس چل کر آتا۔“ فرمانے لگے: ”خواجہ دو جہاں آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ یہ بات سن کر علامہ بے تاب ہو گئے اور ان کے رخصت ہونے کے بعد روتے ہوئے فرمانے لگے: ”کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گنہگار کو تمسک بالمدین سمجھ کر آنحضور ﷺ کے ارشاد کے اتباع میں بغرضِ خوشنودی رسولؐ ملنے آئے ہیں۔“

مصر میں آپ کی ملاقات مشہور صحافی اور تاریخ داں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل سے بھی ہوئی۔ 4 دسمبر کی شام کو آپ نے ”شبانِ المسلمین“ سے انگریزی میں خطاب کیا۔ اگلے روز مسجد عمرو بن العاصؓ پہنچے۔ امام شافعیؒ کے مزار پر آپ دیر تک قرآن مجید کی تلاوت کرتے

رہے۔ جامعہ ازہر پہنچے اور کچھ دیر منطق، تفسیر اور حدیث کے درس میں شریک رہے۔

اقبال — فلسطین میں

6 دسمبر کو یہ حضرات بیت المقدس پہنچے۔ استقبال کے لئے خود مفتی اعظم امین الحسینی تشریف لائے۔ مؤتمر عالم الاسلامی کے افتتاحی اجلاس میں دنیا کے ہر اسلامی ملک کے نمائندے شریک تھے۔ اجلاس کے بعد تمام شرکاء مسجد اقصیٰ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ نے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مسجد اقصیٰ پہنچ کر نماز مغرب ادا کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد مفتی اعظم نے اپنا خطبہ پڑھا۔ ان کے بعد اقبال نے تقریر کی۔ دوسرے اجلاس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ مفتی اعظم اتفاق رائے سے صدر منتخب ہوئے۔ چار نائب صدر منتخب کئے گئے جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ اقبال نے بعد میں ”فلسطینی عرب سے“ خطاب کرتے ہوئے ایک مختصر نظم بھی لکھی۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جینوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں ہنجہ یہود میں ہے!
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے!

تیسری گول میز کانفرنس

جب دوسری گول میز کانفرنس بھی ہندوستان کے آئینی مسائل حل نہ کر سکی تو حکومت انگلستان نے تیسری گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس 17 نومبر 1932ء کو شروع ہوئی اور 24 دسمبر کو ختم ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کانفرنس میں شرکت کے علاوہ نیولین کے مزار پر حاضری دی، مشہور محقق میگ نون سے ملاقات کی جس نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ دانٹے کی تصنیف Divine Comedy

اسلامی روایات و حکایات سے ماخوذ ہے۔ پھر مشہور فلسفی برگساں سے بھی طویل ملاقات کی اور اس کے نظریہٴ زماں پر بحث کی جسے علامہ اسلامی تصور کے بہت قریب سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال نے ”نیولین کے مزار پر“ کے عنوان سے جو نظم لکھی اس کے اشعار یہ ہیں۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
جوشِ کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفسِ قبر کی شب ہائے دراز!

پروفیسر برگساں سے ملاقات کے دوران جب علامہ اقبال نے اسے اسلامی تصورِ زماں کے سلسلے میں آنحضور ﷺ کی یہ حدیث سنائی: ”زمانے کو برا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے“ تو یہ حدیث سنتے ہی برگساں ششدر رہ گیا اور کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور اقبال سے پوچھنے لگا: ”کیا یہ واقعی حدیث ہے؟“

مسجدِ قرطبہ

سپین کے سفر کے دوران جو چیز علامہ اقبال کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث بنی وہ مسجدِ قرطبہ تھی جو سپین میں مسلمانوں کے سات سو سالہ دورِ حکومت کے گواہ کے طور پر موجود تھی اور بڑی شان سے ایستادہ تھی۔ اس مسجد کو گر جاگھر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اقبال نہ صرف اس مسجد کو دیکھنا چاہتے تھے بلکہ یہاں نماز بھی پڑھنا چاہتے تھے

لیکن رکاوٹ یہ تھی کہ چین کے قانون کے مطابق اس مسجد میں اذان دینا اور نماز پڑھنا ممنوع تھا۔ پروفیسر آرنلڈ کی کوشش سے اقبال کو اس شرط کے ساتھ مسجد میں اذان دینے اور نماز ادا کرنے کی اجازت دی گئی کہ وہ مسجد میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے مقفل کر دیں۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی اقبال نے اپنی آواز کی پوری قوت کے ساتھ اذان دی: ”اللہ اکبر اللہ اکبر“۔ سات سو سال کے طویل عرصے میں یہ پہلی اذان تھی جو مسجد کے درودیوار سے بلند ہوئی۔ اذان سے فارغ ہونے کے بعد اقبال نے مصلیٰ بچھایا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز میں آپ پر اس قدر رقت طاری ہو گئی کہ گریہ وزاری کو برداشت نہ کر سکے اور سجدے کی حالت ہی میں بے ہوش ہو گئے۔ جب آپ ہوش میں آئے تو آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہ رہے تھے اور سکون قلب حاصل ہو چکا تھا۔ جب آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو یکا یک اشعار کا نزول ہونے لگا، حتیٰ کہ پوری دعا اشعار کی صورت میں مانگی۔ اس دعا کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی میری آرزو تُو ہی میری جستجو
پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو!

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سوا!
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو!

علامہ اقبال مسجد قرطبہ کی شان و شوکت سے بڑے متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں
نے مسلمانانِ ہسپانیہ کے شاندار ماضی کے پس منظر میں ”مسجد قرطبہ“ کے عنوان سے
ایک طویل نظم لکھی جو علامہ کے نظریہ حیات اور فنِ شعر کا شاہکار ہے۔۔
سلسلہ روز و شب، نقشِ گر حادثات
سلسلہ روز و شب، اصلِ حیات و ممت

پین کے مشہور دریا وادی الکبیر کے کنارے بیٹھ کر اقبال نے مسلمانوں کی نشاۃ

ثانیہ کا خواب دیکھتے ہوئے لکھا۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی!
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!
عالمِ نو ہے ابھی پردہٴ تقدیر میں!
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرہٴ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگِ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلابِ موت ہے وہ زندگی
روحِ اُم کی حیاتِ کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!
نقش ہیں سب ناتمامِ خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سوداے خامِ خونِ جگر کے بغیر!

پین کے سفر کے بعد علامہ 22 فروری 1933ء کو واپس وطن پہنچ گئے۔ اکتوبر

میں سر اس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی معیت میں تدوین نصاب کے سلسلے میں حکومت افغانستان کی دعوت پر براہ خیر کابل گئے اور براہ غزنی و قندھار واپس آئے۔ دسمبر 1933ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس سے اگلے سال علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

نادر شاہ والی افغانستان کو قرآن مجید کا ایک نسخہ پیش کرتے ہوئے اقبال نے شاہ

سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”اہل حق کی یہی دولت ہے۔ اسی کے باطن میں حیاتِ مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔

یہ ہر ابتدا کی ابتدا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیر شکن بنتا ہے۔

میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے۔“

سفر افغانستان کے علاوہ درون ملک بھی کئی شہروں کے دورے کئے۔ متعدد بار

بھوپال گئے۔ حیدرآباد دکن گئے۔ علی گڑھ، کشمیر اور پانی پت گئے۔ دسمبر 1928ء میں

”مدراس مسلم ایسوسی ایشن“ کی دعوت پر مدراس گئے جہاں آپ کا قیام تین یوم تک

رہا۔ وہاں آپ نے تین لیکچر دیئے۔ باقی تین لیکچر حیدرآباد میں دیئے۔ یہ چھ لیکچر

انگریزی میں تھے جو بعد میں Reconstruction of Religious

Thoughts in Islam کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپے اور اردو میں ترجمہ

ہوئے۔ 1934ء میں سرہند کا سفر کیا اور حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری

دی۔ اس سفر میں آپ کے ہمراہ آپ کے فرزند جاوید اقبال بھی تھے جن کی عمر اس

وقت تقریباً دس سال تھی۔ سرہند جانے کے متعلق سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں

لکھتے ہیں:

”آج شام کی گاڑی سے سرہند جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد

میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے یہ پیغام دیا:

ہم نے جو خواب تمہارے اور ٹکلیب ارسلان (اتحاد اسلامی کے زبردست

داعی) کے متعلق دیکھا ہے وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم

پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کہ کون ہے۔ اسی خواب کی بناء پر وہاں کی
حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جب جاوید پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ
جب وہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت مجدد کے مزار پر لے جاؤں گا۔ وہ بھی ساتھ جائے
گا، تاکہ یہ عہد بھی پورا ہو جائے۔“

آخری ایام

عمر کے آخری حصے میں علامہ اقبال کو مختلف بیماریوں نے آلیا۔ ادھر ان کی بیگم
(والدہ جاوید) کی علالت کی وجہ سے ان کی پریشانیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ آپ
وکالت کا کام جاری نہ رکھ سکے۔ یوں آپ کی آمدنی گھٹ گئی اور گزر اوقات مشکل سے
ہونے لگی۔ علامہ اقبال کے دوست سر اس مسعود آپ کی مالی پریشانیوں سے بخوبی
آگاہ تھے۔ چنانچہ انہی کی کوششوں سے نواب بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپے
وظیفہ مقرر کیا گیا۔ شکر یے کے طور پر سر اس مسعود کو خط لکھا: ”خدا تعالیٰ ان کو جزائے
خیر دے۔ انہوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو
بقیہ ایام ان کی خواہش کے مطابق قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔“
دولتِ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے مدارِ المہام سر اکبر حیدری نے ایک ہزار
روپے کا چیک بھیجا۔ اس چیک کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں سر اکبر حیدری کی
طرف سے لکھا تھا: ”یہ رقم شاہی توشے خانے سے ہے جس کا انتظام میرے ذمہ ہے۔
بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔“

”جس کا انتظام میرے ذمہ ہے“ کے الفاظ علامہ اقبال کی خوددار طبیعت پر گراں
گزرے۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا، چیک واپس
کر دیا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر آپ نے ایک مختصر سی نظم بھی لکھی، جس کے چند اشعار
یہ ہیں۔

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پر دیز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
 حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
 میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سردوش
 کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
 غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
 جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

صحت کی طرف سے جب مایوسی ہو گئی تو انہوں نے بچوں (جاوید اور منیرہ) کی
 تولیت بعض عزیزوں اور دوستوں کو سونپ دی۔ رشید احمد صدیقی کی مساعی سے ایک
 جرمن خاتون نے ان کا گائیڈ بنا قبول کر لیا۔ 1937ء کے موسم گرما میں مس ڈورالینڈ
 نے جسے عام طور پر بیگم حسین کے نام سے پکارا جاتا تھا، ”جاوید منزل“ کا چارج
 سنبھال لیا اور یوں علامہ اقبال کو ایک بڑی فکر سے نجات حاصل ہوئی۔

حج کی خواہش نا تمام

آخری عمر میں علامہ اقبال کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح حج
 کر لیں اور مدینہ منورہ میں روضہ نبویؐ پر حاضری دے سکیں۔ ایک دفعہ عبدالرحمان
 طارق صاحب آپ سے ملنے کے لئے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر گئے۔ سردیوں کے دن
 تھے اور آپ برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ طبیعت پر ایک کیف اور وجد کا
 عالم طاری تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بار بار آسمان کی طرف
 انگشت شہادت اٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

ادب گاہست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایس جا

(آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی نازک تر ہے۔ یہاں تو جنید

اور بایزید جیسی بزرگ ہستیاں بھی ادب و احترام سے دم بخود حاضر ہوتی ہیں۔)

تقریباً پندرہ منٹ تک یہی عالم رہا۔ جب طبیعت قدرے بحال ہوئی تو طارق

صاحب نے عرض کیا: ”آپ ادب گاہ مدینہ کی زیارت کے لئے مدت سے بے چین ہیں۔ اس آرزو کو کب عملی جامہ پہنائیں گے؟“

ایک آہ سرد بھر کر فرمایا: ”اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حج کے لئے بھی کچھ شرائط عائد کر رکھی ہیں۔ ان میں سے اہم ترین شرائط یہ ہیں کہ انسان کسی کا مقروض نہ ہو، والدین اور بیوی بچوں کے لئے خرچ چھوڑ جائے اور حج کے لئے اس قدر زادِ راہ لے کر جائے کہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ میرے پاس نہ اتنی گنجائش ہے اور نہ میں یہ آرزو پوری کر سکتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فراقِ رسولؐ میں مرغِ بسل کی مانند تڑپ رہا ہوں اور اسی سوز و درد کا شب و روز لطف لیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے علامہ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو ٹپکنے لگے اور اپنی یہ رباعی دو تین مرتبہ پڑھی۔

غم راہی نشاط آمیز تر گن
فغانش را جنوں آمیز تر گن
بگیر اے ساربان راہِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر گن

(اے ساربان راہِ حجاز! اس راہی کے غم میں نشاط و خوشی کا مزید اضافہ کر اور اس کے آہ و فغان میں کچھ اور جنوںِ عشق شامل کر۔ اے ساربان! منزلِ محبوب کی جانب کوئی راہِ دراز اختیار کر اور یوں میرے سوزِ جدائی کو اور بھی تیز کر دے۔)

وفات سے کچھ عرصہ پہلے بہاول پور کے ایک پیر صاحب کوچ کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر آپ کا شوق اور بھی تیز ہو گیا۔ آپ نے سفر حج کے لئے باقاعدہ تیاریاں شروع کر دیں۔ کسی نے کہا، صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں سے بھی پانی اتر رہا ہے۔ اس حالت میں آپ حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس پر آپ نے پُر جوش لہجے میں فرمایا: ”آنکھوں کا کیا ہے! آخر اندھے بھی توجح کر آتے ہیں۔“

آخری بیماری

آخری عمر میں جبکہ علامہ کی بائیں آنکھ بھی جواب دے چکی تھی ان کا حافظہ بہت

تیز ہو گیا تھا اور انہیں اس بات پر کوئی افسوس نہ تھا کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ بیماری میں بھی خطوں کا جواب باقاعدگی سے لکھواتے تھے۔ کبھی جاوید سے، کبھی نذیر نیازی صاحب سے اور کبھی کسی اور دوست سے خط لکھواتے۔ اب ان کی دلچسپی کے دو محور تھے۔ اول یہ کہ مسلمانوں کی بہتری کے لئے کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے یا کیا کچھ کرنا چاہئے۔ دوم یورپ کے سیاسی حالات کیا کروٹ بدل رہے ہیں۔ چونکہ انہیں جنگ عظیم دوم کے برپا ہونے کا یقین تھا اس لئے یورپ کے حالات خاص طور پر پڑھوا کر سنتے تھے۔ جب کوئی شخص ان کی مزاج پُرسی اور عیادت کے لئے آتا تو اس سے یہ ضرور پوچھتے ”آج کیا خبر ہے؟“

بیماری کی حالت میں ایک رات کافی دیر تک گریہ زاری کرتے رہے۔ کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا:

”خدا جانے مسلمان قوم کا کیا حشر ہوگا۔ مجھے اس کا خیال رہ رہ کر سنا تا ہے۔“

جب سے بیماری میں شدت آئی تھی، صبح کی تلاوت چھوٹ گئی تھی۔ آپ کسی سے قرآن پڑھوا کر سن لیتے۔ اس دوران میں آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہتے۔ تلاوت کے چھوٹ جانے کا ذکر اس شعر میں کس حسرت سے کیا ہے۔

در نفس سوزِ جگر باقی نماند

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

ایک دفعہ علی بخش سے کہا کہ نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ نماز کے لئے وہ خود تو وضو نہیں کر سکتے تھے، علی بخش نے لیٹے لیٹے انہیں وضو کرا دیا۔ چنانچہ آپ نے چار پائی پر بیٹھ کر نماز پڑھی۔

3 مارچ 1938ء کو ضعف قلب اس قدر بڑھ گیا کہ غشی طاری ہو گئی۔ چنانچہ حکیم قرشی کا علاج شروع کیا گیا جس سے حالت ذرا سنبھل گئی، لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہی اور تکلیف عود کر آئی۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے تسکین کے چند کلمات کہے تو علامہ نے فوراً جواب دیا: ”میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا“۔ اس کے

نشان مرد مومن باتو گویم

چو مرگ آید، تبسم بر لب اوست

ایک دفعہ ممتاز حسین انہیں ملنے کے لئے آئے۔ اپنی بیماری کے بارے میں عجیب و غریب توجیہ کرتے ہوئے آپ نے قدرے مسکرا کر کہا: ”یہ جو میں زندگی اور کائنات کے بڑے بڑے راز آپ لوگوں کو بتاتا ہوں، یہ بیماری اس کی سزا ہے۔“

19 مارچ کو پاؤں پر ورم آ گیا اور جگر نے اپنا فعل سرانجام دینا کم کر دیا۔

25 مارچ کو بیماری نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔

20 اپریل کو آقا مرتضیٰ احمد خاں عیادت کے لئے آئے۔ عین اسی وقت جاوید

اقبال جو اس وقت تیرہ سال کے تھے، کمرے میں وارد ہوئے۔ علامہ نے بیٹے کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا: ”بیٹا! تم میرے پاس آ کر بیٹھا کرو۔ میں شاید چند روز کا مہمان ہوں۔“

حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ ابھی کم عمر ہے، اس لئے آپ کی بیماری سے گھبرایا

گھبرایا رہتا ہے۔ علامہ نے فرمایا: ”اسے ہر افتاد کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا

کرنی چاہئے۔“

20 اپریل کی رات علامہ اقبال کے پاس مش (میاں محمد شفیع) ڈاکٹر عبدالقیوم

اور راجہ حسن اختر موجود تھے۔ آخری رات کے متعلق جاوید اقبال اپنی تصنیف ”مئے

لالہ فام“ میں لکھتے ہیں:

”آخری رات عقیدت مندوں کا جھگھٹا تھا۔ میں کوئی دو بجے ان کے کمرے

میں داخل ہوا تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ پوچھا: ”کون ہے؟“ میں نے جواب

دیا: ”جاوید ہوں۔“ ہنس پڑے اور بولے: ”جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔“

پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری محمد حسین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”اسے

جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا ”خطاب بہ جاوید“ ضرور پڑھوادیجئے۔“

شانوں میں درد ہونے لگا تو علامہ نے علی بخش کو شانے دبانے کے لئے کہا۔ پھر

اچانک لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا دیے۔ اوپر کی طرف آنکھیں اٹھائیں، بایاں ہاتھ
دل پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا: ”یا اللہ“۔ اس کے ساتھ ہی سر
پچھے کی طرف ڈھلک گیا، اور قبلہ رو ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پانچ بج کر چودہ
منٹ پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

وفات سے دس منٹ پہلے اقبال نے اپنے بارے میں یہ رباعی کہی تھی جو وصال
کے وقت آپ کے ہونٹوں پر جاری تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

پیام منظوم: شاعری کے مجموعوں کا تعارف

علامہ اقبال کی فلسفیانہ شاعری کے بارہ مجموعے شائع ہوئے جن میں سے چار اردو اور آٹھ فارسی میں ہیں۔ یہاں ان مجموعہ ہائے کلام کا تعارف ان کی ترتیب طباعت و اشاعت کے لحاظ سے کرایا جا رہا ہے۔ ان مجموعوں میں شامل ہر شعر اور ہر مصرع نو جوانوں ہی کو مخاطب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

(1) اسرارِ خودی

فارسی زبان میں یہ مثنوی سب سے پہلے 1915ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ کے والد محترم نے ایک دفعہ ان سے فرمائش کی تھی کہ وہ بوعلی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر فارسی زبان میں ایک مثنوی لکھیں۔ چنانچہ اقبال نے پہلے 150 اشعار لکھے، لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ ان اشعار میں ان کا مافی الضمیر صحیح طریقے سے ادا نہیں ہو پایا، اسے تلف کر دیا۔ چند سال کے بعد اسے دوبارہ لکھنا شروع کیا اور یہ کام 1914ء میں ختم ہوا۔

اس مثنوی میں افلاطون اور خاص طور پر حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کی گئی تھی۔ چنانچہ حافظ کے معتقدین نے سخت طوفان برپا کر دیا۔ جب یہ سلسلہ طول پکڑ گیا اور علامہ کے والد نے ان سے حقیقتِ حال سے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا: ”میں نے حافظ کی ذات اور شخصیت پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے صرف ایک اصول کی تشریح کی ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ مسلمانانِ وطن پر عجیبی اثرات اس قدر غالب آچکے ہیں کہ وہ زہر کو آبِ حیات سمجھتے ہیں۔“ علامہ کے والد صاحب نے فرمایا کہ حافظ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر اس اصول کی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ اقبال نے جواب دیا کہ ”یہ حافظ پرستی بھی تو بت پرستی سے کم

نہیں۔“ اس پر علامہ کے والد نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو غیر مسلموں کے خداؤں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے حافظ سے متعلق جن اشعار پر لوگوں کو اعتراض ہے، انہیں حذف کر دینا مناسب رہے گا۔ علامہ نے مسکرا کر اپنے والد کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور دوسرے ایڈیشن میں متعلقہ اشعار حذف کر کے ان کی جگہ نئے اشعار لکھ دیئے۔

بحیثیت مجموعی ”اسرارِ خودی“ کو بہت سراہا گیا۔ ایک صحبت میں ایران کے پروفیسر محمد کاظم شیرازی بھی موجود تھے۔ جب یہ مثنوی پڑھی جا رہی تھی تو پروفیسر موصوف اشعار سن کر جھوم رہے تھے اور ایک ایک شعر پر داد دیتے ہوئے بار بار کہتے تھے: ”کاش یہ شاعر ایران میں پیدا ہوا ہوتا!“

”مثنوی اسرارِ خودی“ کو انگلستان میں بھی خوش آمدید کہا گیا۔ پروفیسر نکلسن نے جب ”اسرارِ خودی“ پڑھی تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبال کو لکھا کہ وہ اس مثنوی کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں اور باقاعدہ اجازت کے خواہاں ہیں۔ جب یہ خط علامہ اقبال کو لاہور میں موصول ہوا تو وہ بے اختیار رو پڑے۔ فقیر وحید الدین نے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: ”میرے عوام جن کے لئے میں نے یہ کتاب لکھی، نہ تو اس کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں اور نہ اسے کوئی بڑا کام سمجھتے ہیں، لیکن یورپ کے لوگ جن کے لئے میں نے یہ کتاب نہیں لکھی، میرا پیغام سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

1920ء میں ”اسرارِ خودی“ کے انگریزی ترجمے کے ساتھ ہی علامہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کئی نقادوں نے اس کتاب پر بیش قیمت تبصرے لکھے۔ امریکہ کے دانشور ڈاکٹر ہربرٹ ریڈ نے 25 اگست 1921ء کو لکھا:

”..... میرے ذہن میں اگر کسی زندہ شاعر کا خیال آ سکتا ہے کہ تو وہ ایک ہی ہے، اور وہ بھی لازمی طور پر ہمارا ہم قوم ہے نہ ہمارا ہم مذہب۔ میری مراد اقبال سے ہے جس کی مثنوی ”اسرارِ خودی“ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ڈاکٹر ریٹلڈ نکلسن کے قلم سے اصل زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر میسرز میکلسن پبلشرز کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ ہمارے ہم وطن

شاعر بلیوں اور بیڑوں پر تک بندی سے اپنے یاروں کی ضیافت طبع کا سامان پیدا کر رہے تھے اور کیٹس کے انداز میں پیش پا افتادہ مضامین پر طبع آزمائی میں مشغول تھے عین اس وقت لاہور میں یہ نظم تصنیف ہوئی جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے خیالات میں ایک محشر پا کر دیا ہے.....“

(2) رموزِ بے خودی

1918ء میں ”اسرارِ خودی“ کا دوسرا حصہ فارسی زبان میں ”رموزِ بے خودی“ کے نام سے شائع ہوا۔ ”اسرارِ خودی“ کے برعکس اس میں افراد کو خودی مٹانے کا درس نہیں دیا گیا بلکہ کہا گیا ہے کہ افراد اپنی خودی کی تکمیل کے بعد وسیع تر ملت کے استحکام کے لئے اپنی خودی کو ملت کی خودی میں ضم کر دیں۔ بعد ازاں یہ جدت پیدا کی گئی کہ ”اسرارِ خودی“ اور ”رموزِ بے خودی“ کو ”اسرار و رموز“ کے نام سے یکجا کر کے 1940ء میں شائع کیا گیا۔ ”رموزِ بے خودی“ کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آربری نے اور عربی ترجمہ عبدالوہاب نے کیا جو 1955ء میں قاہرہ سے شائع ہوا۔ ترکی زبان میں دونوں مثنویوں کا ترجمہ 1950ء میں چھپا۔ جسٹس ایس اے رحمن نے اردو میں صرف پہلے حصے یعنی ”اسرارِ خودی“ کا ترجمہ ”ترجمانِ اسرار“ کے نام سے کیا۔

(3) پیام مشرق

یہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ 1922ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب جرمن شاعر گوستے کی تصنیف ”پیامِ مغرب“ کے جواب میں لکھی گئی۔ گوستے نے مشرقی ادبیات کا مطالعہ کیا تھا، بالخصوص مولانا روم کی مثنوی سے کافی استفادہ کیا، لیکن ان کے فلسفے کے بہت سے حصوں سے اتفاق نہیں کیا اور اپنی ساری کوشش یہ ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ مغرب ہی دنیائے انسانیت کے مسائل حل کرنے کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس سے علامہ اقبال کے جذبہ ملی کوٹھیس پہنچی اور انہوں نے گوستے کی تردید کرتے ہوئے ثابت کیا کہ جس علم سے آج مغرب فیض اٹھا رہا ہے وہ مشرق کا اور

خصوصاً مسلمانوں کا ورثہ ہے۔

”پیامِ مشرق“ کا انتساب افغانستان کے ایک سابق فرماں روا امیر امان اللہ خان نیازی کے نام کیا گیا ہے جس کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کتاب کے دیباچے میں لکھا:

”اس وقت دنیا میں اور بالخصوص مشرقی ممالک میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔ اسی بناء پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرماں روا نے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت خاص طور پر ان کے مد نظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔“

”پیامِ مشرق“ کے پہلے ایڈیشن پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اس میں اہلِ عجم ہی کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور عجم ہی کی بہتری کیوں چاہی گئی ہے۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں اس اعتراض کے پیش نظر علامہ اقبال نے صفحہ اول پر یہ آیت لکھوادی: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾

اس کتاب میں وہ معارف بیان کئے گئے ہیں جو افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوموں کے زوال، اجتماعی افسردگی، سیاستِ حاضرہ کی فریب کاریوں اور یورپ میں انسانیت کی مٹی پلید کئے جانے کے ذکر کے ساتھ ساتھ تفسیر کائنات، میلادِ آدم، افکارِ ابلیس، ہبوطِ آدم اور قیامت کا قصہ فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 1956ء میں ”پیامِ مشرق“ کا فرانسیسی ترجمہ میر و وچ ایرانے کیا۔

(4) بانگِ درا

یہ علامہ اقبال کا اولین اردو شعری مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ 1924ء میں شائع ہوا۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد علامہ کا ذوقِ سخن اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ انہیں اپنے ابتدائی دور کے اشعار دیکھ کر ندامت سی محسوس ہوتی تھی اور وہ اپنے اس سارے دفتر کو تلف کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران میں ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ اردو

کلام شائع کیا جائے۔ 10 دسمبر 1923ء کو مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار ”زمیندار“ کے ادارے میں علامہ پر زور دیا کہ وہ اپنا اردو کلام اشاعت کے لئے پریس میں دے دیں۔ چنانچہ انہیں اپنے عقیدت مندوں کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ ابھی وہ ابتدائی تیاریاں کر رہے تھے کہ حیدرآباد دکن کے مولوی عبدالرزاق نے علامہ سے اجازت لئے بغیر حیدرآباد سے ”کلیاتِ اقبال“ شائع کر دی۔ اقبال نے اس غیر قانونیت اور بے قاعدگی کا فوری نوٹس لیا، لیکن سزا کبر حیدری کے توسط سے ایک ہزار روپے رائلٹی طے ہو جانے کے بعد علامہ نے انہیں اس شرط پر ”کلیاتِ اقبال“ فروخت کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ اس کی فروخت کو حیدرآباد تک ہی محدود رکھیں گے۔

”بانگِ درا“ علامہ اقبال کی تمام تخلیقات میں سب سے مقبول اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والا مجموعہ کلام ہے۔

(5) زبورِ عجم

اس کا پہلا ایڈیشن جون 1927ء میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے پہلے اس کتاب کے لئے ”زبورِ جدید“ کا نام تجویز کیا تھا، لیکن بعد میں ”زبورِ عجم“ رکھا گیا۔ اس مجموعے میں فارسی کی 66 غزلیں ہیں، جن میں عشق، عاشق، معشوق، شراب، جام، صراحی اور زخسار کی پرانی عجمی اصطلاحات کو بالکل نئے معنی اور پیرائے میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب عشق کا تعلق عاشق اور معشوق سے نہیں رہا بلکہ انسان، خدا اور اقبال کی مشابہت کے اندر ہی گھومتا ہے۔ اب عشق سے مایوسی اور قنوطیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ رجائیت اور اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ ”زبورِ عجم“ کا دوسرا حصہ ”گلشنِ رازِ جدید“ کے نام سے شامل ہے جو مثنوی کی طرز پر تصوف کے موضوع پر شیخ محمود شبستری کی مشہور تصنیف ”گلشنِ راز“ کے جواب میں لکھی گئی۔ تیسرا حصہ ”بندگی نامہ“ ہے جس میں انہوں نے غلامی کے برے اثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے اور آزادی کے لئے ایک نیا ولولہ اور ہوش پیدا کیا ہے اور اسی حوالے سے آزاد اور غلام قوموں کے فنِ تعمیر اور دیگر فنون

لطیفہ پر تبصرہ کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ”زبورِ عجم“ بد حال اور بے آسرا افراد کی اخلاقی پستیوں کا تذکرہ ہے، جس کے ذریعے انہیں مایوسی سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(6) جاوید نامہ

علامہ اقبال نے اٹلی کے شاعر دانٹے کی شاعرانہ تصنیف ”ڈیوائن کامیڈی“ کے جواب میں تین سال کی شبانہ روز محنت شاقہ کے بعد ”جاوید نامہ“ لکھ کر 1932ء میں شائع کیا۔ یہ دراصل ”معراج نامہ“ ہے، جس میں علامہ تخیل کے پر لگا کر افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ اس ذہنی و روحانی معراج کے دوران ان کی ملاقاتیں کئی مسلم اور غیر مسلم مشاہیر سے ہوتی ہیں۔ مسلم مشاہیر کے ساتھ ساتھ غیر مسلم مشاہیر کا ذکر کرنا علامہ اقبال کی وسیع الشمولی اور وسعتِ قلبی کی دلالت کرتا ہے۔ ”جاوید نامہ“ میں علم، عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کا بھی ذکر ہے۔ کشمیر جنتِ نظیر کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا بیان بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں ”خطاب بہ جاوید“ (سخنہ بہ نژادوں) شامل ہے جو نو جوانوں کے نقطہ نظر سے خاص چیز ہے۔ ”جاوید نامہ“ علامہ اقبال کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس کا ترکی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر اینی میری شمل نے 1958ء میں انقرہ سے شائع کیا۔ اٹلی میں بوسانی نے اسے جرمن زبان میں منتقل کیا۔

(7) بال جبریل

یہ اردو کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ”بانگِ درا“ کی اشاعت کے گیارہ سال بعد 1935ء میں شائع ہوا۔ پہلے اس مجموعے کا نام ”نشانِ منزل“ تجویز ہوا تھا۔ ”بال جبریل“ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر اس آخری نقطے تک پہنچ چکی ہے جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مقام اتصال ہے۔ یہ نوری نقطہ انسان کی ”خودی“ ہے۔ اقبال نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو طرح طرح سے اپنی جولان گاہِ فکر بنایا ہے اور شاعرانہ لطافتِ بیان سے اس خشک اور سنجیدہ ترین عقدے کی

گرہ کشائی میں طبع رسا اور توجہ کامل کی تمام توانائیاں اور رعنائیاں صرف کردی ہیں۔

(8) مثنوی مسافر

یہ مثنوی 1934ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی میں ہے۔ والی افغانستان نادر شاہ نے افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کی غرض سے ہندوستان کی تین مقتدر شخصیتوں کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ علامہ اقبال کے علاوہ سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی بھی شریک سفر تھے۔ علامہ اقبال نے افغانستان کا سفر کرنے کے بعد اپنے تاثرات اس ”مثنوی“ کی صورت میں ظاہر کئے تھے۔

(9) ضربِ کلیم

”بانگِ درا“ کے بعد علامہ کی شاعری کا ارتقائی زینہ ”بالِ جبریل“ اور ”ضربِ کلیم“ ہیں جو ”بانگِ درا“ ہی کے بطن سے ظہور پذیر ہوئے۔ ان دونوں مجموعوں کا دائرہ فکر زیادہ وسیع اور آفاق گیر ہے۔ ”بالِ جبریل“ کی اشاعت سے اگلے برس 1936ء میں ”ضربِ کلیم“ شائع ہوئی۔ ”ضربِ کلیم“ میں اقبال کے دل و دماغ پر فلسفہ اپنی بھرپور طاقت سے غالب نظر آتا ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہ ایک بے نظیر متکلم کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفہ تشکیک کی گرد سے آلودہ ہے، لیکن اعلیٰ علم کلام ذیل و برہان کی رو سے مسائل سلوک و عرفان کا حل پیش کرتا ہے۔

پہلے اس مجموعے کے لئے ”صویر اسرائیل“ کا نام تجویز ہوا تھا، لیکن بعد میں یہ نام ”ضربِ کلیم“ سے بدل دیا گیا۔ یہ کتاب نواب سر حمید اللہ خان آف بھوپال کے نام سے منسوب ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ خواجہ عبد الحمید عرفان نے 1957ء میں کیا۔ انگریزی ترجمے کی سعادت 1947ء میں وی ایس کرنان کو حاصل ہوئی، جنہوں نے اسے نہایت اہتمام کے ساتھ بمبئی سے شائع کیا۔

(10) پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق

یہ فارسی مثنوی 1936ء میں ”ضربِ کلیم“ کی اشاعت کے فوراً بعد شائع ہوئی۔

اس مثنوی کی تخلیق کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ 13 اپریل 1936ء کو علامہ اقبال بھوپال کے شیش محل میں سوئے ہوئے تھے کہ رات کے تین بجے سرسید نے ان سے خواب میں پوچھا: ”اقبال! تم کب سے بیمار ہو؟“ علامہ نے جواب دیا: ”دو سال سے“۔ سرسید نے فرمایا: ”حضور رسالت مآب ﷺ کے حضور کیوں التجا نہیں کرتے“۔ اس پر ان کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے عرضداشت کے طور پر چند اشعار کہے جو بعد میں مثنوی کی شکل اختیار کر گئے۔

(11) ارمغانِ حجاز

یہ علامہ کی آخری کتاب ہے جس کا کچھ حصہ اردو میں ہے اور باقی فارسی میں۔ اس طرح یہ دو کتابیں ہو گئیں۔ یہ علامہ کی وفات کے بعد نومبر 1938ء میں شائع ہوئی۔ حج پاک کا جذبہ اس تصنیف کا محرک بنا۔ علامہ چاہتے تھے کہ وہ حج کے دوران حضور پاک ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضر ہو کر یہ کتاب خود پیش کریں، لیکن افسوس کہ قضا نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ اس کتاب میں علامہ کے نظریات و خیالات کا جو ہر موجود ہے۔ ”ارمغانِ حجاز“ پانچ موضوعات پر مشتمل ہے:

1- حضورِ حق 2- حضورِ رسالت 3- حضورِ ملت

4- حضورِ عالمِ انسان 5- بہ یارانِ طریق

”ارمغانِ حجاز“ میں کئی رباعیات ایسی بھی ہیں جن میں علامہ کی توحید پرستی کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ شاعر کے کلام میں دل کا سوز اور تڑپ صفحے صفحے پر نمایاں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ مدینہ جانے کے لئے بہت بے قرار ہیں۔ علامہ اقبال اس کتاب کو نواب حمید اللہ خان آف بھوپال کے نام معنون کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، جس کا اظہار انہوں نے سر راس مسعود کے نام ایک خط میں کر دیا تھا، مگر سر راس مسعود علامہ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے اور یہ کتاب بھی علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

نوجوانوں کے لئے پیامِ اقبال کا ارتقا

نوجوان یا نئی نسل یا اقبال کی اصطلاح میں ”نژادِ نو“ سے کیا مراد ہے؟ نئی اور پرانی نسل میں کیا فرق ہے؟ عموماً ایک نسل کا زمانہ تیس سال کے قریب بتایا گیا ہے۔ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال لیتے ہیں تو وہ پرانی نسل کا حصہ بننے لگتے ہیں، یعنی تیس پینتیس سال کی عمر تک تو انسان نئی نسل کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کے بعد پرانی نسل کا فرد بن جاتا ہے، مگر نئی اور پرانی نسل میں امتیاز کرنا اور ان کے درمیان کوئی واضح لکیر کھینچنا ممکن نہیں، کیونکہ ہر لمحہ نئی نسل پرانی نسل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا مستقبل حال میں اور حال ماضی میں تبدیل ہو رہا ہے اس لئے اگر کسی ایک وقت میں ایک نسل نئی ہوتی ہے تو ذرا آگے چل کر وہی نسل پرانی ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی اور پرانی نسل (بچے، جوان، بوڑھے) بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ مگر جو بات یہاں خاص طور پر ذہن نشین ہونی چاہئے، وہ یہ ہے کہ نئی نسل اپنے جذباتی اور فکری رویوں میں پرانی نسل سے مختلف ہوتی ہے۔ نئی نسل کے افراد میں فکر کی کمی اور جذبے کی فراوانی ہوتی ہے، جبکہ پرانی نسل میں جذبے کی کمی اور فکر کی زیادتی ہوتی ہے۔ وہ سوچتے زیادہ مگر عمل کم کرتے ہیں۔ اس اصول میں استثناء کی گنجائش موجود رہتی ہے، مگر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ نئی نسل کے افراد ”نوجوان“ ہوتے ہیں اور ان کے جسم میں زیادہ توانائی ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے مستقبل سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ ایک نوجوان کو مادی دولت کی اتنی پروا نہیں ہوتی، جتنی ایک بوڑھے شخص کو ہوتی ہے۔ نئی نسل عموماً مالی و اقتصادی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتی ہے اور اسے اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ دولت کے بغیر بھی زندگی بسر کر سکتی ہے، جبکہ پرانی نسل دولت کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ دراصل عملی زندگی (اور خصوصاً پرانی

نسل) نے نوجوانوں کو یہی سبق پڑھایا ہوتا ہے کہ دولت زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے اور اس سے سارے کام بنائے یا بگاڑے جاسکتے ہیں، مگر نوجوان مادی دولت کے اس طلسماتی اثر سے آزاد ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ شادی بیاہ کے معاملے میں جہاں پرانی نسل جہیز وغیرہ کا مطالبہ کرتی ہے، وہاں نئی نسل پیسے کی بجائے محبت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان دولت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ بوڑھے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، جبکہ نوجوان بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ پرانی نسل عقل کے سہارے چلتی ہے تو نئی نسل جذبے (بقول اقبال ”عشق“) کی قوت سے انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی تمام امیدیں نئی نسل سے وابستہ کر دی ہیں۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ اے خدایع جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نئی نسل کے کچھ افراد ذہنی طور پر پرانی نسل سے اور اسی طرح پرانی نسل کے کچھ افراد ذہنی طور پر نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا نئی اور پرانی نسل کا ذکر کرتے ہوئے عمر سے زیادہ ”روئے“ کو اہمیت حاصل ہے۔ عمر کا وہ حصہ جہاں نئی اور پرانی نسل کا سنگم ہوتا ہے، بڑا اہم اور پُر اثر ہوتا ہے۔ زمانہ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے، مگر بعض افراد زمانے کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور بعض افراد میں یہ اہلیت نہیں ہوتی۔ جب نوجوان نئی ذمہ داریوں سے آشنا ہوتے ہیں تو ان پر بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ”بزمِ انجم“ میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا

منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اگر پرانی نسل کے افراد نئے زمانے (نئی نسل) کے تقاضوں کو نہ سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذہنی ارتقارک گیا ہے۔ ایسی صورت میں نئی اور پرانی نسل میں بعد (generation gap) پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئی نسل

کے تمام افکار و اعمال درست ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نئی نسل زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر دے اور اپنے آپ کو غیر ضروری مسائل میں الجھالے۔

علامہ اقبال کے وقت کی نئی نسل آج پرانی ہو چکی ہے، بلکہ اب تو دوسری تیسری نئی نسل وجود میں آ چکی ہے۔ اقبال کے مخاطب نو جوان دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں یا پیرانہ سالی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ علامہ اقبال کے مخاطب صرف اُن کے عہد کے خاص نو جوان تھے۔ انہوں نے شاہین نئی نسل نژاد نو یا اپنے فرزند جاوید اقبال کے تلازمات کے ذریعے دراصل ہر دور اور ہر عہد کے مسلمان نو جوانوں کو خطاب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل میں آنے والے تمام ادوار کے نو جوان بھی اقبال کے پیغام سے مستفید ہوں گے۔ پیام اقبال سے صرف وہی نو جوان منحرف ہو سکتے ہیں جو اپنے ماضی سے تعلق توڑ لیں، حال سے تغافل برتیں اور مستقبل سے بے اعتنائی اختیار کریں۔

اقبال کی شاعری تین واضح حصوں میں منقسم ہے۔ اُن کی جوانی کی شاعری ان کی پختہ سالی کی شاعری اور آخر میں اُن کے بڑھاپے کی شاعری۔ لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں اُن کا مخاطب صرف نو جوان ہے اور موضوع سخن بیشتر وہ جذباتی کیفیات رہی ہیں جو جوانی سے خاص ہیں اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلوغ فکر کے اعتبار سے اقبال اگرچہ اپنی جوانی ہی میں پختہ سال اور پختہ سالی میں پیرانا ہو چکے تھے، لیکن ان عناصر کے اعتبار سے اُن کی شاعری اُن کے فلسفے اُن کے جذبات اُن کے محسوسات اُن کے پیغام کے جو بنیادی عناصر ہیں وہ ہمیشہ جوان رہے اور اُن کے سخن کی حرارت اور اُن کے پیغام کا خروش نو جوانوں کے خون کی روانی کو تیز کرتا اور انہیں تسخیر ذات اور تسخیر کائنات دونوں پر آمادہ کرتا رہا۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور فطری طور پر مطالعے اور تیاری کا دور ہے۔ اُن کی جوانی کی شاعری کے بارے میں شیخ عبدالقادر ”بانگِ درا“ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

”طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ اُن کے دوست اور بعض طالب علم جو قریب ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دُھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اُس ابتدائی زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً اُن پر طاری ہو جاتی تھی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے اشعار اس طرح زبان سے نکلیں، اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان میں وہ خود انہیں قلم بند بھی نہیں کرتے۔ مجھے بہت سے شعرا کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے، مگر یہ رنگ کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونی، طبع، وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے، مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمائش وہ کچھ لکھ سکے، یہ قریب قریب ناممکن ہے۔“

اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں وہ سوز اور وہ سیمابی کیفیت موجود ضرور ہے جسے اُن کے نظامِ سخن کی اولین خصوصیت کہنا چاہئے اور جو آگے چل کر اُن کی فکری اور الہامی شاعری پر سربہ سر چھا گئی، لیکن ابھی اُس نے وہ تلاطم انگیز اور آفاق گیر رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو شعرِ اقبال کے دوسرے اور تیسرے دور سے نسبت رکھتا ہے۔ اقبال کے عہد شباب کا شعر خود نگری اور خود شناسی کی ایک لطیف و جمیل کیفیت سے سرشار ہے اور جب شاعر اس کیفیت سے ذرا چونکتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش پر بھی ایک نظر ڈال لیتا ہے، لیکن اُس کے پاس اپنے مطالعہ نفسی کے اظہار اور ایک دلِ درد مند کی پکار کے سوا اور کوئی پیغام نہیں ہے۔ نوجوان شاعر اپنے نوجوان ہم عصروں کو کوئی پیغام دینے سے فطری طور پر ہچکچاتا ہے اور یہ اُس کی حقیقت پسندی اور عظمت کا ایک قطعی ثبوت ہے۔

ابھی تو نو جوان شاعر خود اپنی ذات کے تشخص میں مصروف ہے۔ ابھی تو وہ اپنی ذات سے مخاطب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب نو جوان اقبال خود اپنی ذات کی شناخت میں منہمک تھا تو اس کی اپنی زندگی کی کیا کیفیت تھی؟ اُس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز میں ہو رہی تھی؟ وہ اپنے بارے میں کیا سوچتا تھا؟ ان سوالوں کے جواب ہم خود اقبال کے اشعار میں ڈھونڈتے ہیں۔

حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی ماٹل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب، جو محفل ہی نہ ہو
ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جو ہر نکلتا کیوں نہیں
(صدائے درد)

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسپر فریب نگاہ ہوں
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں!
(شمع)

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
آزاد فکر سے ہوں، عزت میں دن گزاروں
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے
کیا لطف انجمن کا، جب دل ہی بجھ گیا ہو
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو!
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
دنیا کے غم کا دل سے، کانٹا نکل گیا ہو
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے
(ایک آرزو)

جوانی کی شاعری میں اقبال حالات حاضرہ، اہل ہند کی غلامی اور فرنگیوں کے سامراجی حربوں پر بھی کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان! مجھ کو

کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
 وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
 وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
 تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
 ذرا دیکھ اُس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
 دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
 نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے، اے ہندوستان والو!
 تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
 ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
 لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
 جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
 تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
 مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
 چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
 مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
 کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
 دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
 تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

(تصویر درد)

”ترانہ ہندی“ بھی عہد شباب کی شاعری کی تخلیق ہے۔ یہ ترانہ حصولِ آزادی
 کے بعد بھارت کی حکومت نے سرکاری ترانے کے طور پر منظور کر لیا ہے۔
 سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
 ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں بیر رکھنا
 ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا
 اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
 معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اقبال کے عہد شباب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت خود نگری اور خود شناسی ہے، البتہ یہ شاعری اس طوفان کے ابتدائی خروش اور اولین بے تابیوں کا ایک ہلکا سا اظہار ہے جو شروع دن سے اس کے قلب و جگر میں پرورش پا رہی تھیں۔ نوجوان اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہنمائی کی کوشش نہیں کرتا، لیکن لاشعوری طور پر اس کا مخاطب نوجوان ہی ہے۔ تاہم اقبال کھلم کھلا نوجوان سے گفتگو کرتا، بلکہ اپنے پردہ دل کا ایک کونا اٹھا کر دعوتِ نظارہ دے دیتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی بے حد دلچسپ ہے کہ زندگی کی اس منزل پر خود اس کے اپنے نفس کی کیا کیفیت تھی، اور اس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز سے جاری تھی! اس کا جواب اقبال نے اپنی بہت ہی سادہ نظم ”زہد اور رندی“ میں نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں درحقیقت اقبال نے اپنا تجزیہ نفس کیا ہے، جیسے وہ خود آئینے کے روبرو ہوں۔ پوری نظم ملاحظہ ہو:

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی	تیزی نہیں منظور، طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی نشی کا	کرتے تھے ادب اُن کا اعلیٰ و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت	جس طرح کہ الفاظ میں مضمحل ہوں معانی
لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی	تھی تہ میں کہیں دُردِ خیال ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی	منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
دلت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے	تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا	اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا؟	گو شعر میں ہے رشکِ کلیم ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا	ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشبیح بھی ذرا سا	تفضیل علیٰ ہم نے سنی اس کی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
 کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
 گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
 لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
 مجموعہ اضمداد ہے اقبال نہیں ہے
 رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
 اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
 القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
 اس شہر میں جو بات ہواڑ جاتی ہے سب میں
 اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد
 فرمایا 'شکایت وہ محبت کے سبب تھی
 میں نے یہ کہا' کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
 خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے
 گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
 میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت سے شناسا
 مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
 اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
 عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
 اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
 بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
 دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
 پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی
 ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
 تادیر رہی آپ کی یہ نغزیانی
 میں نے بھی سنی اپنے اجبا کی زبانی
 پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
 تھا فرض مرا' راہ شریعت کی دکھانی
 یہ آپ کا حق تھا زورہ قرب مکانی
 پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
 پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمہ دانی
 گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
 کی اس کی جدائی میں بہت اشک نشانی
 کچھ اس میں تمسخر نہیں' واللہ نہیں ہے

بظاہر یہ ایک لطیف اور شگفتہ مکالمہ ہے، لیکن غور کیجئے تو اس کے ذریعے سے
 نوجوان شاعر نے اپنے ہم عصر نوجوانوں کو نہ صرف اپنی شخصیت و سیرت کی تعمیر کا ایک
 ہلکا سا منظر دکھایا ہے، بلکہ اس آزاد خیالی، روشن خیالی اور کشادہ دلی کا ایک واضح تصور بھی
 اُن کے سامنے رکھ دیا ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کے خلاصے اور جوہر کا دوسرا نام ہے۔

نوجوان اقبال جب اس جوہر طبیعت اور اس اندازِ تربیت سے آراستہ ہو کر
 1905ء میں تکمیلِ تعلیم کے لئے یورپ گیا تو اُسے مغرب میں اپنی فکر کو جلا دینے اور
 اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ ان کا ایک حیرت انگیز اثر

اس کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ یورپی ممالک کی جارحانہ وطن پرستی سے بے زار ہو گیا اور عالم اسلام کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدت سے اُس کے ذہن پر چھا گیا اور اسے یقین کامل ہو گیا کہ ہندی مسلمان بلکہ مسلمانانِ عالم کی آزادی و ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خالص اسلامی شعائر و اقدار کو زندہ کریں اور مذہب کے رسوم و نظاہر سے نہیں بلکہ روح اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں جن کی صداقت پر خود گردشِ زمانہ نے بار بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

چنانچہ یورپ کے دورانِ قیام اقبال کے جن افکار و خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا، وہ اکثر و بیشتر اسی تاثیر کے حامل ہیں۔ پنجاب کے بابائے اردو یعنی شیخ عبدالقادر بھی انہی دنوں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے مقیم تھے، مگر وہ اقبال سے ایک سال پہلے ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ اُن کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اقبال نے انہیں ایک منظوم مراسلہ لکھا جو ”بانگِ درا“ میں شامل ہے۔ بظاہر یہ مراسلہ ایک دوست کا خط ہے مگر درحقیقت اُس دردِ پہاں کا طوفان ہے جو اُن دنوں شاعر کے دلِ دردمند میں کروٹیں لے رہا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر اُن کو
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
رختِ جاں بت کدہ چیں سے اٹھالیں اپنا
دیکھ! میثرب میں ہوا ناقہ لیلیٰ بیکار
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ
شمع کی طرح جیسے بزمِ گہ عالم میں

ہندوستان سے بڑھ کر اب ملتِ اسلامیہ کے ایک حساس، نوجوان شاعر کے سینے

میں جس قسم کے جذبات تلاطم برپا کر رہے تھے، یہ نظم لطیف ان کی ہلکی سی آئینہ داری کرتی ہے۔ لیکن یہاں بھی اقبال نے خود نگری اور خود شناسی سے صرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور اپنی بے تابیوں میں محض ایک رفیقِ دور افتادہ کو شریک کیا ہے۔ اپنے ہم عصر نوجوانوں کو اس نے اب بھی براہ راست کوئی پیغام نہیں دیا، اگرچہ اپنا سینہ چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوتِ ہم نفسی ضرور نمایاں ہے۔

ایک طرف اقبال اپنے رفیقِ دور افتادہ کو اٹھنے اور بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کرنے کی دعوت دے رہے ہیں تو دوسری طرف اہل مغرب کو ان کی تہذیب کی خامیوں کے باعث براہ راست چیلنج بھی دے رہے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
 کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زیرِ کم عیار ہو گا
 تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
 جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا
 میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کارواں کو
 شرفشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

(مارچ 1907ء)

پھر اقبال کی شاعری کا دوسرا دور آیا جب اقبال نے پختہ سالی کی منزل میں قدم رکھا اور وہ روایتی حق حاصل کیا جس کی رو سے شاعر یا فلسفی اپنے خیالات و جذبات براہ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبال اس بارے میں بہت وضع دار تھے۔ انہوں نے اس حق کا استعمال اس وقت تک نہیں کیا جب تک وہ نوجوانی کے دائرے سے نکل کر پختہ سالی کی منزل میں داخل نہیں ہو گئے۔ یہاں بھی ان کے مخاطبین محض نوجوان تھے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ہر جگہ براہ راست نوجوان کا نام لے کر اس سے خطاب نہیں کیا، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ان کے موضوعات میں سے کوئی موضوع ایسا نہیں جس کا تعلق نوجوان، جوان، مرد، مردِ جوان ہمت اور اس

کے عمل و کردار سے نہ ہو۔

اپنی معروف نظم ”خطاب بہ جوانانِ اسلام“ میں اقبال نے ایک منفیانہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہاں جوانانِ اسلام کی موجودہ زبوں حالی کا تلخ جائزہ لے کر خاموش ہو گئے ہیں۔ ابھی اقبال نے مسلم نوجوان کو صرف نادم و شرمسار کیا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلے سے نہیں لگایا۔ ابھی اس گم کردہ منزل کی طرف اشارہ کیا ہے جسے از سر نو حاصل کرنا اس کے لئے مقدر ہو چکا تھا، مگر ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ شاید یہ احساسِ ندامت اقبال کے مخاطب نوجوان کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا اُس کے بعد پیدا ہونے والا جذبہ یقین۔ فرماتے ہیں۔

کبھی اے نوجوانِ مسلم ! تدبیر بھی کیا تُو نے؟
 وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
 تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
 کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
 تمدنِ آفریںِ خلاقِ آئینِ جہاں داری
 وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
 سماں الفقری فخری کارہائشانِ امارت میں
 بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
 گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
 کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
 غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرائیں کیا تھے
 جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
 اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
 مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
 کہ تُو گفتار وہ کردار تُو ثابت وہ سیارا
 گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
 ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
 حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
 نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
 مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
 جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارا

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور الہامی شاعری کا دور ہے۔ اس دور میں اقبال پر یہ
 منکشف ہو چکا تھا کہ اُس کے وطن کے نوجوانوں پر عنقریب نیابتِ الہی کی ذمہ داریاں عائد
 ہونے والی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتے
 ہیں۔ خصوصاً اُن کی لازوال نظم ”طلوعِ اسلام“ جس کا نام ہی پینمبرانہ بشارت رکھتا ہے
 اس ضمن میں بہترین مثال ہے۔ یہ نظم اُن نظموں کی تمہید کہی جاسکتی ہے جن میں نوجوانوں کو
 براہِ راست مخاطب کیا گیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
 مسلمان سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے
 خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو، زباں تُو ہے
 یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تُو ہے
 پرے ہے چرخِ نیلی قام سے منزلِ مسلمان کی
 ستارے جس کی گر دراہ ہوں، وہ کارواں تُو ہے
 مکاں فانی، مکیں آئی، ازل تیرا، ابد تیرا
 خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تُو ہے
 حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
 تری نسبت برا ہی ہے، معمارِ جہاں تُو ہے

تری فطرت میں ہے ممکناتِ زندگانی کی
 جہاں کے جوہر مضمحل کا گویا، امتحان تو ہے
 جہاں آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
 نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغان تو ہے
 یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
 کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
 سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
 لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال نے اپنے تینوں تخلیقی ادوار کے دوران پوری شاعری میں تین بنیادی نظریات دیئے ہیں یعنی خودی، فقر اور عشق۔ یہ تین باطنی اوصاف ہیں۔ جس شخص میں یہ تینوں اوصاف بدرجہ اتم موجود ہوں، وہ اقبال کی زبان میں ”مومن“ ہے اور اس کی تشبیہ شاہین یا شاہباز۔ ان تین اعلیٰ تعمیر اور مثبت اخلاقی اوصاف کے حصول میں عصر حاضر میں تین بڑی رکاوٹیں ہیں، جن کا ذکر اقبال بڑی درمندی سے کرتے ہیں۔ اول سچے مذہب سے دوری اور کفر و الحاد اور لادینیت، اختیار کرنا، دوم سچے علم سے دوری اور جدید تعلیم کے مضر اثرات کا پھیلاؤ، سوم سچی تہذیب سے دوری اور مغربی تہذیب، اختیار کرنے کے مضر اثرات۔ ان شعبوں میں نوجوانوں کو عمل و کردار کی تلقین کے ساتھ ساتھ اقبال نے دخترانِ ملت اور پھر نوتہالان کو بھی اُن کے ذہن و مزاج کے مطابق اپنے پیغامِ خوش کلام سے نوازا ہے۔ نوجوانوں کو اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اس سے منسلک ”اتحاد عالمِ اسلامی“ کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں بھی خطاب کیا ہے۔ اپنے فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کر کے گویا پوری ملتِ اسلامیہ کے فرزندوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

آئندہ ابواب میں انہی موضوعات و عنوانات کے تحت کلامِ اقبال سے ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے، جو نوجوانوں کے نامِ پیغام کی حیثیت بھی رکھتے ہوں

اور اُن سے براہ راست ”مخاطبت“ کا پہلو بھی رکھتے ہوں۔ گویا ان موضوعات کی نسبت سے آئندہ ابواب کے عنوان یہ ہوں گے:

الف) نوجوان کے مثبت باطنی اوصاف:

(1) خودی، ایمان، یقین

(2) فقر، غیرت

(3) عشق — عشق قرآن، عشق رسول

(4) مومن

(5) شاہین

ب) نوجوان کے منفی ظاہری اوصاف جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے:

(5) سچے مذہب سے دوری — کفر و الحاد اور لادینیت کا فروغ

(6) سچے علم سے دوری — جدید تعلیم کے مضر اثرات

(7) سچی تہذیب سے دوری، مغربی تہذیب کے مضر اثرات

(8) دخترانِ ملت کے نام

(9) نونہالانِ ملت سے خطاب

(10) اسلامی نشاۃ ثانیہ — عالم اسلام کا اتحاد

(11) پیام بذریعہ جاوید اقبال

(12) پیام منشور

خودی

اقبالیات کے ایک بڑے مفسر اور شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی تصنیف ”حکمت اقبال“ میں کلام اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفہ خودی کی مفصل اور منظم تشریح کی ہے۔ خودی کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”اقبال کی حکمت میں خودی سے مراد وہ شعور ہے جو خود شناس اور خود آگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو، لیکن یہاں شعور کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں، بلکہ وہ چیز ہے جس کا خاصہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے یا جس کی وجہ سے ایک انسان تمیز یا ہوش رکھتا ہے۔ انسان میں یہی چیز ہے جو خود شناس یا خود آگاہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ”میں“ کہتی ہے، اس لئے اقبال اس کو ”انا“ یا ”ایغو“ یا ”من“ بھی کہتا ہے اور پھر یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان زندہ ہے اور جب مرتا ہے تو یہی وہ چیز ہے جو اس کے جسم سے رخصت ہو جاتی ہے، اس لئے اقبال اس کے لئے ”روح“ اور ”جان“ کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے اور اس کو ”زندگی“ اور ”حیات“ کے ناموں سے بھی تعبیر کرتا ہے۔

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی

روح کس جوہر سے؟ خاک تیرہ کس جوہر سے ہے؟

زندگی بغیر شعور کے نہیں ہوتی، لہذا ان معنوں میں کہ شعور زندگی ہے، ایک خاص سطح کا شعور حیوان میں بھی موجود ہے، لیکن حیوان کا شعور آزاد نہیں، بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ناقابل تغیر جہتوں کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا شعور اہلوں سے آزاد ہو کر اور ان کی مخالفت میں بھی عمل کرتا ہے، اس لئے کہ وہ خود شناس اور خود آگاہ ہے، اور اپنے مقاصد کو جانتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے فقط سوچتا، جانتا اور محسوس کرتا ہے، لیکن انسان اپنے شعور کی وجہ سے نہ صرف جانتا، سوچتا اور

محسوس کرتا ہے بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ جانتا سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس لئے ہم انسان کے شعور کو خود شناس اور خود آگاہ کہتے ہیں۔ اسے شعور نہیں بلکہ خود شناسی، خود شعوری یا خود آگاہی کہنا چاہئے۔ اقبال اسی کو ”خودی“ کہتا ہے۔

خود آگاہی

خود آگاہی خودی کی ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے کائنات برپا ہے اور انسان کی ساری تنگ و دو اور جدوجہد اسی خاصیت کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے خودی اپنے آپ کو آنکھوں کے بغیر دیکھتی ہے، کانوں کے بغیر سنتی ہے، بلکہ اپنے آپ کو کسی حس کی مدد کے بغیر براہ راست پوری طرح سے جانتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں، کیونکہ میں سوچ رہا ہوں، جان رہا ہوں اور خوشی یا غم محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن میری کوئی حس مجھے اپنے آپ کو جاننے میں مدد نہیں دے رہی۔ اگرچہ میں اپنی خودی کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، لیکن اس کے باوجود ان آنکھوں کے بغیر اس طرح سے دیکھ رہا ہوں کہ میرے لئے اپنے آپ کا علم ان چیزوں کے علم سے بدرجہا زیادہ یقینی ہے جن کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ بلکہ میں جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جانتا ہوں، ان کا جانتا میرے لئے اسی وجہ سے ممکن ہے کہ میں اپنی خودی کو جانتا ہوں، کیونکہ ان کا علم وہی ہے جس کو میری خودی جانتی ہے اور میری خودی سے باہر ان کا کوئی علم نہیں، لہذا اگر میں اپنی خودی کو نہ جانوں تو دنیا کی کسی چیز کو دیکھنے کے باوجود نہیں جان سکتا۔ اگر دنیا بھر میں کسی چیز کا یقینی علم ہمیں حاصل ہے تو وہ فقط اپنی خودی کا علم ہے۔ ہم اپنی خودی کے علم سے ہی اپنے دوسرے غیر خودی کے علم کو پہنچتے ہیں۔

خودی کا وجود فریب یا وہم نہیں

خارج کی دنیا کے متعلق ہمارا علم قیاسی ہے اور ہمارا قیاس حواس پر مبنی ہوتا ہے۔ حواس کے تاثرات کے بدلنے سے خواہ اس کا کوئی سبب خارج میں ہو یا نہ ہو، ہمارا علم بدل جاتا ہے، اس لئے کوئی شخص کائنات کے متعلق تو کہہ سکتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت

نہیں اور زمین و آسمان درحقیقت موجود نہیں ہیں یا ان کی حیثیت ایک ایسے خواب یا وہم سے زیادہ نہیں جو خالق کائنات کی ہستی کے لئے ایک پردے کا کام دے رہا ہے لیکن کوئی شخص خودی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ایک وہم ہے۔ خودی کا وجود محسوس دنیا، خارجی دنیا یا مادی دنیا کی چیز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے حواس اور ہمارے قیاسات اس کو جاننے کا وسیلہ نہیں بنتے۔

زمان و مکاں سے بے نیازی

اس کے باوجود کہ خودی انسان کے جسدِ عنصری میں جاگزیں ہے جو سلسلہ لیل و نہار کی پابندیوں میں گھرا ہوا ہے وہ خود زمان و مکاں کی حدود و قیود سے آزاد ہے کیونکہ وہ اپنے خیال کے ذریعے سے ادھر ماضی اور مستقبل کی انتہاؤں تک اور ادھر کائنات کے دور دراز گوشوں تک جہاں روشنی بھی کروڑوں برس میں آتی ہے، آن واحد میں جا پہنچتی ہے۔

چونکہ ہم خودی کو کسی حالت میں بھی نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان ہاتھوں سے چھو سکتے ہیں اور غیر کی خودی اپنی خودی نہیں ہوتی کہ ہم حواس کی مدد کے بغیر براہ راست اسے دیکھ سکیں۔ ہم غیر کی خودی کا علم خواہ وہ خودی خدا کی ہو یا انسان کی فقط اس کے مظاہر اور اثرات اور اعمال اور افعال کے مطالعے ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

خودی ایک نورانی طاقت ہے

خودی ایک نور ہے لیکن مادی روشنیوں میں سے کوئی روشنی ایسی نہیں جو اس کی مماثل ہو اور پھر خودی ایک قوت ہے لیکن مادی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے ساتھ اس کو مشابہت دی جاسکے۔ یہی وہ نورانی طاقت ہے جس کا انسان میں اور دنیا کی ہر چیز میں ظہور ہے۔ یہی زندگی ہے۔

کلمات پر غالب آنے کی خواہش

لفظ خودی کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ اقبال نے اس لفظ کو استعمال کر کے

انگریزی لفظ Self کا فارسی یا اردو ترجمہ کیا ہے جو مدت سے فلسفہ کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہو رہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ خودی کی اس سادہ اور معروف فلسفیانہ اصطلاح کو سمجھنے میں بالعموم اقبال کے ایسے معتقدین کو بھی دقت آتی ہے جو اس کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خودی کا لفظ اب تک فارسی اور اردو میں ایک اور معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے، یعنی خود پرستی، خود مختاری، خود سری، خود رائی، خود پسندی، خود غرضی، غرور، نخوت اور تکبر کے معنوں میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنی قوم کی موجودہ حالت کے پیش نظر خودی کی گونا گوں فطری صفات میں سے اس صفت پر خاص زور دیا ہے جس کا ایک پہلو خود نمائی ہے یا ذوق تقویٰ ہے۔

اس صفت کی رو سے خودی ایک مقصد کا تصور کرتی ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت سعی و عمل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے اسے اپنے مقصد میں حائل ہونے والی مخالف قوتوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کا یعنی اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور اس خود اظہاری سے اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح روزمرہ کی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ خودی کے ساتھ معنی کا اشتراک رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک جذبہ خود نمائی یا ذوق استیلاء کے جائز اور ناجائز استعمال میں کوئی خاص خوبی ہے اور اقبال کی تعلیم یہی ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو اس جذبے کا اظہار کیا جائے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ یہاں اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے دو گزارشات ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ خودی کے مقاصد اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ جدوجہد یا عمل سے خودی کو مستقل اور مکمل اطمینان اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب اس کا مقصد اس کی فطرت کے مطابق ہو، غلط مقصد کی پیروی سے خودی کو عارضی تسلی ہو تو ہو، لیکن آخر کار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی جدوجہد آخر کار خود اس کے اندرونی فطری مقصد کو

تھکت دے دیتی ہے۔ اور دوسری گزارش یہ ہے کہ عمل یا جدوجہد احساس مدعا کا لازمی نتیجہ ہے اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مدعا (اچھا یا برا، صحیح یا غلط) رکھنے پر مجبور ہے لہذا ہر وقت عمل یا جدوجہد کرنے پر بھی مجبور ہے۔ غلط مدعا غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مدعا صحیح عمل پیدا کرتا ہے۔ اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتا ہے جو خودی کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو یعنی صحیح ہو۔ اُن کے نزدیک صحیح مدعا یا صحیح عمل فقط ”مرد مومن“ کا امتیاز ہے۔ گویا اقبال نے جو عملی جدوجہد اور خودنمائی پر زور دیا ہے اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد یا مدعا کو درست کریں۔ اسی کو وہ یقین محکم یا ایمان کہتا ہے۔ اگر مدعا ناقص سے پاک اور شکوک و شبہات سے آزاد ہو کر درست ہو جائے تو وہ ایک طاقتور عزم یا ارادہ عمل بن جاتا ہے۔

اقبال کی وضاحت

اقبال نے خود اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ خودی سے اس کی مراد تکبر یا غرور نہیں۔ ”اسرار خودی“ کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے:

”ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی مغرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا یقینِ ذات ہے۔“

قاضی نذیر احمد کے نام اپنے مکتوب میں اقبال نے لکھا ہے:

”اسرار خودی اور رموز بے خودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا میری کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا غرور یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے۔“

نقطے پر اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نوٹ ”اقبال اکادمی“ کے پاس محفوظ ہے۔

اس نوٹ میں لفظ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے:

”لفظ خودی کو بڑی مشکل سے اور بادلِ خواستہ چنا گیا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے

دیکھا جائے تو اس کے اندر بہت سی خامیاں ہیں۔ اور اخلاقی نقطہ نظر سے اسے

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہمیشہ برے معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ بھی جو ”میں“ کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں اتنے ہی ناموزوں ہیں مثلاً: انا، شخص، نفس، انسانیت۔

ضرورت دراصل اس بات کی ہے کہ ”من“ یا ”ایغو“ کے لئے ایک ایسا لفظ مل جائے جو بے رنگ ہو اور کسی اخلاقی مفہوم کے بغیر ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، فارسی یا اردو میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں۔ فارسی لفظ ”من“ بھی اتنا ہی ناموزوں ہے۔ تاہم شعر کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے سمجھا کہ لفظ ”خودی“ سب سے زیادہ موزوں ہے۔ فارسی زبان میں کسی قدر اس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ لفظ خودی کو ایغو کے سادہ مفہوم یعنی ”من“ کے بے رنگ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے خودی کا لفظ ”من“ کے اس ناقابل بیان احساس کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو ہر فرد انسانی کی بے مثل انفرادیت کی بنیاد ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی طور پر اس لفظ کا کوئی مفہوم ایسے لوگوں کے لئے نہیں جو اس کے اخلاقی مفہوم سے نجات نہیں پاسکتے۔ میں ”زبور عجم“ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔

گر قسم ایں کہ شرابِ خودی بے تلخ است
بدر و خویشِ مگر، زہرِ مابدر مان کش

(خودی کی شراب بے شک تلخ ہے، لیکن اپنے مرض پر نگاہ رکھو اور اپنی صحت کی خاطر میرے زہر کو پی لو۔)

جب میں نفی خودی کی مذمت کرتا ہوں تو مطلب اس سے اخلاقی معنوں میں ایثار یا نفس کشی کی مذمت نہیں ہوتا۔ نفی خودی کی مذمت سے میں ایسے افعال کی مذمت کرتا ہوں، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ”میں“ کو ایک مابعد الطبیعیاتی قوت کی حیثیت سے منادیا جائے، کیونکہ اسے منانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزا بکھر جائیں۔ وہ حیات بعد ممات کے قابل نہ رہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اسلامی تصوف کا نصب العین خودی کو منانا نہیں۔ اسلامی تصوف میں فنا سے مراد انسانی ایغو کو منانا نہیں بلکہ اس کو مکمل طور پر خدا کی ذات کے سپرد کر دینا ہے۔ اسلامی تصوف کا نصب العین ایک ایسا مقام ہے جو فنا کے مقام سے بھی

آگے ہے یعنی مقام بقا جو میرے نقطہ نظر سے اثباتِ خودی کا بلند ترین مقام ہے۔ جب میں کہتا ہوں ”لعل کی طرح سخت ہو جاؤ“ تو میری مراد نطشے کی طرح یہ نہیں ہوتی کہ بے رحم اور بے درد ہو جاؤ، بلکہ یہ ہوتی ہے کہ خودی کے عناصر کو مجتمع کر دیتا کہ وہ بعد از مرگ زندہ رہنے کے لئے فنا کا مقابلہ کر سکے۔

اخلاقی نقطہ نظر سے لفظ خودی (جیسا کہ اسے میں نے استعمال کیا ہے) کا مطلب ہے خود اعتمادی، خودداری، اپنی ذات پر بھروسہ، حفاظتِ ذات، بلکہ اپنے آپ کو غالب کرنے کی کوشش، جیسا کہ ایسا کرنا زندگی کے مقاصد کے لئے اور صداقت، انصاف اور فرض کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت کے لئے ضروری ہو۔ اس قسم کا کردار میرے خیال میں اخلاقی ہے، کیونکہ وہ خودی کو اپنے قویٰ کے مجتمع کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح تحلیل اور انتشار کی قوتوں کے خلاف خودی کو سخت کر دیتا ہے۔ عملی طور پر مابعد الطبیعیاتی ایفودو بڑے حقوق کا علم بردار ہے۔ اول زندہ رہنے کا حق اور دوم آزاد رہنے کا حق، جیسا کہ قانون الہی نے مقرر کیا ہے۔“

خودی کی تعریف و تشریح کے بعد اب یہاں کلامِ اقبال سے خودی کے موضوع پر ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جن کا تعلق نوجوانوں اور ان کی بہبود و ترقی سے ہے۔ پہلے اردو کلام سے اور پھر فارسی کلام سے انتخاب پیش کیا جائے گا۔

تو رازِ کن فکان ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے، گلڑے گلڑے نوحے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ سائل، اچھل کر بیکراں ہو جا
غبارِ آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل، یہ سبز زندگانی ہے
نکل کر حلقہٴ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پریناں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

سا سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازہ صحرًا!

یہی تو حید تھی جس کو نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا
 کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
 کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
 زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!
 تن آساں عرشوں کو ذکر و تسبیح و طواف ادلی!
 (بال جبریل: حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر)
 خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں
 وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں
 خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں!
 وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں
 نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں!
 کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!
 کہ آ رہی ہے دمام صدائے گن فیکوں!
 تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!
 اسی کے فیض سے میرے سبوں میں ہے جنوں!
 (بال جبریل: حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر)
 جو ناز ہو بھی، تو بے لذتِ نیاز نہیں
 شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں
 سبب یہ ہے کہ محبتِ زمانہ ساز نہیں
 میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں
 نغانِ نیم شہی بے نوائے راز نہیں
 (بال جبریل: غزل 15)

تو آججو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!
 مگر یہ حوصلہٴ مردِ ہیچ کارہ نہیں
 کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
 نگہ پیدا کر اے غافل، تجلی عینِ فطرت ہے
 رقاہتِ علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
 خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
 نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذبِ مستی کی

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
 ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
 حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی!
 عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
 ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستی شوق
 سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
 یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
 علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
 اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
 نگاہِ عشقِ دلِ زندہ کی تلاش میں ہے!
 ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
 اک اضطرابِ مسلسلِ غیب ہو، کہ حضور!
 اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
 خودی میں ادا ہے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
 لڑے مقام کو انہم شناس کیا جانے!

تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں
(بال جبریل: غزل 21)

کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی!
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاءہی!
(بال جبریل: غزل 22)

ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ!
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!
یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!
خودی کی موت ہے تیرا ذوالِ نعمت و جاہ!
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ!
(بال جبریل: غزل 23)

ترا علاجِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں
حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں
(بال جبریل: غزل 24)

یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ
شاید کسی حرم کا ٹو بھی ہے آستانہ!
گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ!
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ!
ہیں اس کی گفتگو کے اندازِ محرمانہ!
(بال جبریل: غزل 32)

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!
نہ پوچھاے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے!

یہیں بہشت بھی ہے، حورو جبریل بھی ہے

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے

تری نگاہِ فردمایہ ہاتھ ہے کوتاہ
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
خودی میں گم ہے، خدائی تلاش کر غافل
حدیثِ دل کسی درویشِ بے کلیم سے پوچھ
برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمِ ناک

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ

یہ بندگیِ خدائی وہ بندگیِ گدائی
غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے!
رازِ حرم سے شاید اقبالِ باخبر ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں

(بال جبریل: غزل 33)

تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر!

(بال جبریل: غزل 37)

اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرائیل!
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل!
ترے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل!
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل!

(بال جبریل: غزل 42)

مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا
(بال جبریل: رباعی)

کلیسی رمزِ پنہانی خودی کی!
غریبی میں نگہبانی خودی کی!
(بال جبریل: رباعی)

خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات!
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!
من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک!
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں!

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
نظر نہیں تو مرے حلقہٴ سخن میں نہ بیٹھ
اندھیری شب ہے جد اپنے قافلے سے ہے تو
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
برنگِ بحر، ساحل آشنا رہ!

حکیمی نامسلمانی خودی کی
تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے!
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک!
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
گشس کی راہیں بدلتی ہوئی
سک اس کے ہاتھوں میں سب گراں!

سفر اس کا انجام و آغاز ہے یہی اس کی تقویم کا راز ہے!
 کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
 اسے واسطہ کیا کم و بیش سے تیشب و فراز و پس و پیش سے!
 ازل سے ہے یہ کشکش میں اسیر ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
 خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
 فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

(بال جبریل: ساقی نامہ)

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگلیں جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں
 بیانِ شعوب و قبائل کو توڑ رسوم کہن کے سلاسل کو توڑ
 یہی دینِ محکم یہی فتح یاب کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب!
 (بال جبریل: پنجاب کے دہقان سے)

جرات ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!
 کھلتے نہیں اس قلمِ خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضربِ کلیسی سے نہ چیرے!
 (بال جبریل: ماہر نفسیات سے)

خودی کا تر نہاں لا الہ الا اللہ خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ
 یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ
 کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا فریبِ سود و زیاں لا الہ الا اللہ
 یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند بیانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ
 خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زقاری نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ
 یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ
 اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکمِ اذان لا الہ الا اللہ
 (ضربِ کلیم: لا الہ الا اللہ)

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا!
 وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا
 (ضربِ کلیم: افرنگ زدہ)

مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
داڑو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا!
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفۃ سری کا
(ضرب کلیم: اے پیر حرم)

ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد!
وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد!
پہاں جو صدف میں ہے، وہ دولت ہے خداداد!
(ضرب کلیم: اسرارِ پیدا)

کہ خودی سے میں نے سیکھی لا جہاں سے بے نیازی!
ترا دیں نفس شماری، مرادیں نفس گدازی!
(ضرب کلیم: غزل)

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!
اس آ بجو سے کئے، بحر بیکراں پیدا!
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا!
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا!
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عنان پیدا!
(ضرب کلیم: تخلیق)

حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
دوبارہ زندہ نہ کر کار و بارِ لات و منات
رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات!
(ضرب کلیم: تیاتر)

میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے!

اے پیر حرم، رسم و رہِ خانہ چھوڑ
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
کہہ جاتا ہوں زور جنوں میں ترے اسرار

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے

نہ میں اعجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوئے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے

تری خودی سے ہے روشن ترا حرم وجود
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
حرم تیرا، خودی غیر کی! معاذ اللہ
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے!

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ

تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں
گنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
فرنگ کی رگ جاں بچو یہود میں ہے!
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے!
(ضرب کلیم: فلسطینی عرب سے)

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
وہی شراب وہی ہائے و ہو رہے باقی
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے!
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے!
طریق ساقی و رسم کدو بدل جائے!
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!
(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار: 3)

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان!

تُو بھی اے فرزند کہستاں اپنی خودی پہچان!

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان!

موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز

جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان!

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریاے!

جس کی ہوائیں شند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان!

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان!

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ

اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان!

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان!

تیری بے علمی نے رکھ لی، بے علموں کی لاج
عالم فاضل بچ رہے ہیں، اپنا دین ایمان!

اپنی خودی پہچان
او عاقل افغان!

(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار: 7)

معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا!
اے پیرِ حرم، تیری مناجاتِ سحر کیا؟
اس شعلہ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا!
(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار: 13)

کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات!
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات!
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات!
(ارمغان حجاز: سعود مرحوم)

خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے؟
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟
(ارمغان حجاز: رباغی)

کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر!
(ارمغان حجاز: رباغی)

کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

(ارمغان حجاز: ملازادہ - ضغنم لولابی کشمیری کی بیاض)

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خاقہوں سے

خودی ہے زندہ تو ہے مورتِ اک مقامِ حیات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرا نہ ترا
خودی ہے مُردہ تو مانندِ گاہِ پیشِ نسیم

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوہِ تقدیرِ یزداں

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال

اقبال کا فارسی کلام اُن کے فلسفہ خودی سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر مثنوی ”اسرار و رموز“ تو فلسفہ خودی ہی کی تشریح ہے اور اس فلسفے کا خلاصہ انہوں نے اپنی نظم ”بابائے صحرائی کی نصیحت“ میں کر دیا ہے۔ یہ نصیحت نو جوانوں کے نام ہے۔ ”بابائے صحرائی“ کے پردے میں خود علامہ اقبال جلوہ گر ہیں۔ ”اسرار و رموز“ کا منظوم ترجمہ ”ترجمان اسرار“ کے نام سے جسٹس ایس اے رحمن نے کیا اور انتہائی درد مندی اور مہارت سے کیا۔ یہاں ”بابائے صحرائی کی نصیحت“ کا یہی ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بابائے صحرائی کی نصیحت

تُو اے جو پھول کی مانند مٹی سے پھلا پھولا
 ہوا بطنِ خودی سے تو ریاضِ دہر میں پیدا
 نہ کر ترکِ خودی ہرگز بقا انجام ہو کر رہ
 جو قطرہ ہو کے رہنا ہے تو بحرِ آشام ہو کر رہ
 خودی کے نُور سے ہوتی ہے ہستی تیری تابندہ
 خودی محکم اگر کر لے تو ہو جائے تُو پائندہ
 یہ سودا فائدے کا ہے نہ اس سودے سے ہو غافل
 یہ وہ دولت ہے جس سے تجھ کو ہو گی خواجگی حاصل
 اگر زندہ ہے تُو کیوں نیستی سے ڈرتا رہتا ہے
 ترے قرباں غلط سمجھا ہے تُو جو کچھ بھی سمجھا ہے
 حقیقت مجھ پہ روشن ہے کہ سازِ زندگی کیا ہے
 ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو رازِ زندگی کیا ہے
 خود اپنے آپ ہی میں غوطہ زن مثلِ گہر ہونا
 ابھر کر اپنی خلوت گاہ سے آتشِ نظر ہونا
 دبی چنگاریوں کو راکھ کی ڈھیری میں بھڑکانا
 جو نظروں کو جلا دے ایسا شعلہ زار بن جانا

چہل سالہ مصیبت کا گھروندا پھونک کر رکھ دے
 تو بن کر شعلہ جوالہ اپنے گرد چکر لے
 جو طوفِ غیر ہی کو موت گردانے وہ زندہ ہے
 وجود اپنے کو جو بیت الحرم جانے وہ زندہ ہے
 پروں کو پھڑپھڑا کر تو نکل مٹی کے پھندے سے
 پرندوں کی طرح محفوظ ہو گرنے کے خدشے سے
 اگر طائر نہیں ہے تو، نہ کر پھر امتحاں اپنا
 دہانِ غار پر ہرگز بنا مت آشیاں اپنا
 تری خواہش ہے باغِ علم کے سب پھول تو پھن لے
 پیامِ پیرِ رومی گوشِ دل سے تو مگر سن لے
 نہیں افحی سے کم وہ علم جو بس تن کے کام آئے
 ترا ہدم بنے گا علم اگر وہ دل کو گرمائے
 تجھے معلوم ہے یہ داستاں استادِ رومی کی
 کہ جس کی درس گہ شہرِ حلب میں علم پرور تھی
 پڑی عقلی دلیلوں کی تھی بیڑی اس کے پاؤں پر
 پھنسی تھی اس کی کشتی عقل کے گرداب میں آ کر
 وہ موسیٰؑ تھا مگر بیگانہ سینائے محبت سے
 نہ اس کو عشق سے مس تھا نہ سودائے محبت سے
 تشکک پڑ کبھی اشراق پر اصرار ہوتا تھا
 ہر اک موضوع پر حکمت کے موتی وہ پروتا تھا
 وہ سلجھاتا تھا اکثر قولِ مشائخ کے عقدے
 اجاگر اس کے نورِ فکر سے امرار تھے سارے

کتابوں کے ذخیروں میں سدا محصور رہتا تھا
نشتے میں شرح اسرارِ کتب کے پُور رہتا تھا
اشارہ ہو گیا جب پیر تبریزی کو مرشد کا
جلال الدین کے کتب کا اُس نے رخ کیا سیدھا
کہا یہ شور و غوغا اور یہ قیل و قال کیسے ہیں؟
خدارا یہ قیاس و وہم و استدلال کیسے ہیں؟
کہا یوں مولوی نے ڈانٹ کر: ”خاموش اے ناداں
خردمندوں کی باتوں پر ہنسی تجھ کو نہیں شایاں
پرے ہٹ، دور ہو جا میرے کتب سے او دیوانے
ترا کیا کام ہے اس سے، تو قیل و قال کیا جانے!
ہماری گفتگو تیری سمجھ کی حد سے باہر ہے
اسی کے نور سے ادراک کا شیشہ منور ہے“
بڑھایا سوزِ شمس ان بے طرح باتوں نے ملا کی
بھڑک اٹھی غضب کی آگ سے تب روحِ تبریزی
زمیں پر اس کی نظروں نے گرائے برق کے پارے
نمایاں اس کے سوزِ دم سے مٹی میں ہوئے شعلے
جلایا خرمنِ ادراک یکسر دل کی آتش نے
کیا سب فلسفے کا پاک دفترِ دل کی آتش نے
”ملا عشق کے اعجاز سے واقف نہ تھا اب تک
”سازِ عشق کے نغموں سے تھا نا آشنا اب تک
پکار اٹھا: ”یہ شعلہ کس طرح بھڑکا دیا تو نے
کہ جس سے دفترِ حکمت کو خاکستر کیا تو نے“
کہا یوں شیخ نے: ”ہے مسلم زناہِ بستہ تو
یہ ذوق و حال ہے، خاموش رہ لے اپنا رستہ تو

ترے فکر و تخیل سے ہمارا حال بالا ہے
 جو مس کو زر کرے وہ کیمیا شعلہ ہمارا ہے
 ترے سرمایہ کو ہے برفِ حکمت سے ملا گس بل
 فقط اولے ہی برساتا ہے تیرے فکر کا بادل
 اُٹھ اپنے ہی خس و خاشاک سے آتش فروزاں کر
 تُو اپنی خاک کے ہر ذرہ کو شعلہ بداماں کر
 نہ ہو گر سوزِ دلِ مسلم نہیں ہے علم میں کامل
 یہی ہے معنی اسلام ، تُو ہو تارکِ آفل
 جو ابراہیم نے پائی رہائی بندِ آفل سے
 نہ اس کا بال بیکا کر سکے نمود کے شعلے
 لگن باطل کی ہے تجھ کو تُو علمِ حق کو بھولا ہے
 فقط روٹی کی خاطر نقد دیں کو تُو نے بیچا ہے
 تو سرگردان و آوارہ ہوا ہے دُھن میں سرے کی
 نہاں ہے تیری نظروں سے مگر چشمِ سیہ تیری
 تمنا کر کہ تجھ کو آبِ حیاں دے دمِ خنجر
 تو خواہاں ہو کہ تجھ کو سانپ کے منہ سے ملے کوثر
 طلب کر سگِ اسود تو درِ بُت خانہ سے جا کر
 طلب کر مشک کا نافہ سگِ دیوانہ سے جا کر
 نہ لیکن ڈھونڈ سوزِ عشق ہرگز علمِ حاضر سے
 ملے گا کیفِ حق کا جام کیا اس پختہ کافر سے
 مجھے آوارہ رکھا ایک مدت علم کی لو نے
 بنایا محرمِ راز اپنا مجھ کو دانشِ تُو نے

چمن والوں نے میرا امتحاں کر کے مجھے پرکھا
 کیا ہراز مجھ کو تب انہوں نے اس گلستاں کا
 نہیں گلشنِ حقیقت میں یہ لالہ زار عبرت ہے
 گلِ کاغذ کی صورت یہ سرابِ رنگ و نکہت ہے
 ہوا ہوں قید سے اس گلستاں کی میں رہا جب سے
 بنا ہے آشیانہ شاخِ طوبیٰ پر مرا تب سے
 نظر کے واسطے ہے علمِ نو سب سے بڑا پردہ
 ہے اس کا بُت پرستی، بُتِ فروشی، بتِ گری شیوہ
 پڑی ہے پاؤں میں اس کے مظاہر کی کڑی بیڑی
 حدودِ حس سے یہ نکلے نہیں تدبیر کچھ اس کی
 گرا یوں راہِ ہستی میں ' اسے جینا ہوا دُوبھر
 خود اپنے ہی گلے پہ اُس نے آخر رکھ دیا خنجر
 نہیں ہے اس کی آتش میں حرارتِ لالہ کی صورت
 بظاہر شعلہ رکھتا ہے ' خنک ہے ژالہ کی صورت
 رہی ہے آزاد فطرت اس کی سوزِ عشق سے یکسر
 جہانِ جستجو میں ہے یہ ناکامی کا نوحہ گر
 خرد کے عارضوں کا عشقِ افلاطون ہوتا ہے
 اُترتا ہے جنوں اس کا ' یہ جب نشتر چھوتا ہے
 وہیں سجدے کرے عالم جہاں پر عشق فرمائے
 یہ وہ محمود ہے جو سومناتِ عقل کو ڈھائے
 رہی خالی صراحیِ علمِ نو کی، عشق کی مے سے
 نہ راتیں آشنا اُس کی ہوئیں فریاد کی لے سے
 رہی کم تیری نظروں میں ترے شمشاد کی قیمت
 عطا کی دوسروں کے سرو کو تُو نے مگر رفعت

مثال نے خود اپنے آپ کو تو نے کیا حالی
 بنایا تو نے دل اپنا نوائے غیر کا حالی
 تو خوانِ غیر سے ہے ایک ریزہ مانگتا پھرتا
 تو غیروں کی دکان سے جنس اپنی کا ہوا جو یا
 جل اٹھی بزمِ مسلم کا چراغِ غیر سے آخر
 لگی آگ اس کی مسجد کو شرارِ دیر سے آخر
 حرم کی سرزمین سے جب نکل کر آگیا آہو
 ہوا صیاد کے تیروں سے چھلنی اُس کا پھر پہلو
 پریشاں مثلِ بو ہیں پتیاں گل کی چمن اجڑا
 خودی سے بھاگنے والے پھر اپنی سمت واپس آ
 امانت دی گئی تجھ کو کتابِ پاک کی حکمت
 کہیں سے ڈھونڈ لا اپنی وہی کھوئی ہوئی وحدت
 حصارِ عافیت ملت ہے ہم ملت کے ہیں درباں
 ہوئے ترکِ شعارِ قوم سے ہم تارکِ ایماں
 ہوا ہے ٹکڑے ٹکڑے ساقیِ دیرینہ کا ساغر
 پریشاں بزمِ رندانِ حجازی ہو گئی یکسر
 بتوں سے کعبہ کو آباد رکھنا کام ہے اپنا
 ہنسی جس کی اڑائے کفر وہ اسلام ہے اپنا
 محبت میں بتوں کی شیخ نے اسلام ہارا ہے
 جو سلکِ سبھ لازم ہو اُسے زقارِ پیارا ہے
 سفیدی نے سروں کی ہے بنایا پیر پیروں کو
 ملا موقعِ ہنسی کا ہر گلی کوچہ کے بچوں کو
 ہوئے ہیں لالہ کے نقش سے دل اُن کے بیگانے
 ہوں کی مورتوں سے ہو گئے آباد بت خانے

ہوا ہر مو دراز اب طاق طرزِ خرقہ پوشی میں
 کیا ہے نام ان سوداگروں نے دیں فروشی میں
 سفر میں رات دن رہتے ہیں ساتھ اپنے مریدوں کے
 وہ ہیں نا آشنا ملت کی ہر ادنیٰ ضرورت سے
 نہیں ہے ٹور کوئی مثلِ نرگس اُن کی آنکھوں میں
 دلِ زندہ کی دولت کی کمی ہے اُن کے سینوں میں
 مگن منصب پرستی میں ہوئے سب واعظ و صوفی
 نہیں ہے اعتبار اب ملتِ بیضا کا کچھ باقی
 لگی ہے آنکھ واعظ کی صنم خانے کے منظر پر
 بنا ہے مفتی دینِ مبیں فتووں کا سوداگر
 کیا ہے رخ ہمارے پیر نے میخانے کا سیدھا
 بتاؤ ہمدوم تم ہی کہ ہو تدبیر اپنی کیا؟

فقر

فقر درحقیقت خودی کا ایک ذیلی اخلاقی وصف ہے۔ اقبال کے ہاں یہ اصطلاح مفلسی، فقیری یا گداگری کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئی، بلکہ مشہور حدیث نبویؐ ”الفقر فخری“ (فقر میرا فخر ہے) کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دل کو دنیا سے الگ رکھنا، باہمہ و بے ہمہ رہنا، دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا، دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا سوائے سوزِ دل کے۔ نعمتیں، آسائشیں اور اسباب کی فراوانی انسان کو اندھا بنا دیتی ہیں۔ اس کے دل میں سوزِ قلب نہیں رہتا۔ وہ دنیوی علاقے میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اسے اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ اسی لئے اقبال نوجوانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مناصب و مراتب پر کیوں نہ پہنچ جائیں، لیکن دل درویش رہنا چاہئے۔

تمنا درِ دل کی ہو تو کر خدمت فقروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو پد بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
(بانگِ درا: غزل)

سماں الفقر فخری کار ہاشانِ امارت میں بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرائیں کیا تھے جہاں گیر و جہاں دار و جہاں باں و جہاں آرا
(بانگِ درا: خطاب بہ جوانانِ اسلام)

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی
(بالِ جبریل: غزل 13)

نہ اہاں میں رہے باقی، نہ تو راں میں رہے باقی وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسری
(بالِ جبریل: حکیم سنائی سے)

کہ فقر ہی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ ناچختہ ہے پرویزی، بے سلطنتِ پرویز!

خونِ دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز!
(بال جبریل: حکیم سنائی سے)

تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
وہ قوم جس نے گنویا متاعِ تیموری
(بال جبریل: حکیم سنائی سے)

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدِ الہی!
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی!
(بال جبریل: غزل 34)

یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بُت خانہ
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ
(بال جبریل: غزل 47)

فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم ہے جو یائے راہ فقر ہے دانائے راہ
فقر میں مستی ثوابِ علم میں مستی گناہ!
أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
تیری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ
(بال جبریل: غزل 59)

یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی
(بال جبریل: محبت)

آنکھیں مری بیٹا ہیں، لیکن نہیں بیدار
ہیں اہل نظر کشورِ پنجاب سے بیزار!
پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ و ستار!
طروں نے چڑھایا نشہ خدمتِ سرکار!
(بال جبریل: پنجاب کے پیرزادوں سے)

اب حجرہ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی

میں ایسے فقر سے اے بہلِ حلقہ باز آیا
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی دے باکی

یا شرعِ مسلمانی، یا دیر کی دربانی
میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
علم کا مقصود ہے پاکیِ عقل و خرد
علمِ فقیہ و حکیم فقرِ مسیح و کلیم
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
علم کا "موجود" اور فقر کا "موجود" اور
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آئی یہ صدا سلسلہ فقر ہوا بند
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق

اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری!
 اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!
 میراثِ مسلمانی، سرمایہٴ شبیری!
 (بال جبریل: فقر)

جو فقر سے ہے میسر، تو نگری سے نہیں!
 قلندری مری کچھ کم، سکندری سے نہیں!
 زوالِ بندۂ مومن کا، بے زری سے نہیں!
 قلندری سے ہوا ہے، تو نگری سے نہیں!
 (بال جبریل: مسلمان کا زوال)

کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
 پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار!
 اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
 یا خالدؓ جانناز ہے یا حیدرؓ کراڑ!
 (ضربِ کلیم: آزادی شمشیر کے اعلان پر)
 وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
 یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
 (ضربِ کلیم: سلطانی)

تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
 فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
 رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی
 (ضربِ کلیم: فقر و راہبی)

عشق ہو جس کا جسوز فقر ہو جس کا غیور
 (ضربِ کلیم: غزل)

مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری!
 اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری!
 اک فقر سے شبیری، اس فقر میں ہے میری!

اگر چہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
 اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
 سب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
 اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلمان کبھی تُو نے
 اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں
 ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
 قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن

کے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
 خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
 سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
 یہ فقر مردِ مسلمان نے کھو دیا جب سے

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
 خوددار نہ ہو فقر تو ہے قبر الہی
 پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری!
 ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری!
 (ضربِ کلیم: محرابِ گلِ افغان کے انکار: 15)
 اُس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی!
 (ضربِ کلیم: محرابِ گلِ افغان کے انکار: 16)
 کہ غیرت مند ہے میری فقیری!
 مسلمان کو سکھا دی سر بزیری!
 (ارمغانِ حجاز: رباعی)

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
 خوددار نہ ہو فقر تو ہے قبر الہی

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند

غریبی میں ہوں محسوسِ امیری
 حذر اس فقر و درویشی سے جس نے

عشق

خودی اور ایمان و یقین کی پختگی اگر منزل ہے تو اس منزل تک پہنچنے کا واحد مستقیم راستہ عشق ہے۔ قاضی عبدالغفار نے کیا خوب لکھا ہے:

”اقبال کے سینے میں دور و حوں کا آشیانہ تھا۔ ایک شاعر کی حسن پرست اور عشق پرور روح اور ایک مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح۔ آخری دور میں حسن پرست روح ساکن اور مسلمان کی روح اس طرح ہنگامہ آرا ہو گئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا۔ اب سننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ زبان اردو ہے یا فارسی۔ اقبال کی شاعری نے زبان اور طرز ادا کے امتیازات سے قطع نظر کر لی۔ بس کہے جاتا ہے کہے جاتا ہے جو اس کو کہنا ہے۔ ہر ڈر نے کہا تھا: شاعری نوع انسانی کی مادری زبان ہے۔ اقبال کی شاعری اس قول کی تشریح ہے۔ اس کے لئے اردو اور فارسی کا امتیاز ایک قصہ پارینہ ہے۔“

ابتدائی زمانے میں انہوں نے لفظ ”عشق“ کو اردو اور فارسی کی عام شاعری کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو لفظ ”حسن“ کے مقابل آتا ہے۔ اس مفہوم میں انہوں نے کئی نظمیں لکھیں۔ بعض تلف کر دیں۔ بعض نظمیں جو ”بانگ درا“ میں شامل ہیں ان میں وصال، حسن و عشق، سلیمی، محبت،..... کی گود میں بلی دیکھ کر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لیکن بعد کی شاعری میں لفظ عشق ایک اصطلاح بن گیا اور حسن کی بجائے ”عقل“ کے مقابل آ کر خودی کا حصہ دار بن گیا۔

اس عشق نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، پروان چڑھایا اور اس کی شاعری کونت نئے معانی، افکار کی جولانی اور قوت تاثیر عطا کی۔ اپنی شخصیت کو عشق کی سان پر چڑھانے کے لئے ان کا طریقہ ”آہِ سحر گاہی“ تھا۔ جب سارا عالم خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہتا، اس اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا، پھر گڑ گڑانا اور رونا۔ اقبال علی الصبح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے۔ سفر و حضر ہر مقام اور ہر کہیں

ان کے لئے سحر خیزی ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنے اس آہ و سوز اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے اور دعائیں کرتے کہ الہی! یہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشقِ آج کل کے مسلم نوجوانوں کو بخش دے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشقِ میری نظر بخش دے

شیشہ دہر میں مانند مئے ناب ہے عشقِ دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
روح خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشقِ نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے (بانگِ درا:.... کی گود میں بلی دیکھ کر)

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشقِ عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی عقلِ انسانی ہے فانی، زندہ جاوید عشقِ عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں زندگانی ہے عدم نا آشنا، محبوب کی (بانگِ درا: قلفِ عجم)

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل بے خطر کوڈ پڑا آتشِ نمرود میں عشقِ عشق فرمودہ قاصد سے سبک گامِ عمل عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی عقل ہے جو تماشائے لبِ بام ابھی عقل کبھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی (بالِ جبریل: غزل)

گرچہ تو زندانی اسباب ہے عقل کو تنقید سے فرصت نہیں قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ (بالِ جبریل: غزل)

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (بالِ جبریل: غزل 14)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کانم

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو، تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

(بال جبریل: غزل 13)

عشقِ بے باں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا کھول کے کیا بیاں کروں سزِ مقامِ مرگ و عشق

(بال جبریل: غزل 16)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظیرِ حکیمانہ! نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ

(بال جبریل: غزل 28)

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال! سکہائی عشق نے مجھ کو حدیثِ زندانہ!

(بال جبریل: غزل 34)

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی

(بال جبریل: غزل 41)

عشق تری انتہا، عشق مری انتہا آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز

(بال جبریل: رباعی)

جمالِ عشق و مستی نے نوازی کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر

(بال جبریل: رباعی)

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سرمایہ محراب و منبر

(بال جبریل: رباعی)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی میدان میں آتا ہے زرہ پوش

جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
 عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
 عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
 اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!
 عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
 عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
 عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!
 عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات
 (بال جبریل: مسجد قرطبہ)

نقش گرِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی
 عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی!
 آہ کہ ہے یہ تیغ تیز، پردگی نیام ابھی!
 (بال جبریل: فرشتوں کا گیت)

عشق نہ ہو تو شرع و دین، بتکدہ تصورات
 معرکہ وجود میں بدر و خنین بھی ہے عشق!
 (بال جبریل: ذوق و شوق)

عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب!
 عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب!
 (بال جبریل: ذوق و شوق)

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
 مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحبِ فروغ
 تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
 عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
 عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ
 عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
 عشق فقیرِ حرم، عشق امیرِ جنود
 عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات!

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
 دانش و دین و علم و فن، بندگی ہوس تمام
 جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
 صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق!

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
 گاہ عیلمہ می برد گاہ بزور می کشد

علم نے مجھ سے کہا، عشق ہے دیوانہ پن
 عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین و ظن
 بندہ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن!

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات!
 علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات!
 عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات!

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پہاں جواب!

عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دیر!
 عشق کے ادنیٰ غلام، صاحبِ تاج و نگین!
 عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں!

عشق سراپا یقین، اور یقین فتحِ باب!

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزلِ حرام
 شورشِ طوفاںِ حلال، لذتِ ساحلِ حرام
 عشق پہ بجلیِ حلال، عشق پہ حاصلِ حرام

علم ہے ابنِ الکتاب، عشق ہے امِ الکتاب
 (ضربِ کلیم: علم و عشق)

عشقِ قرآن

اقبال کی زندگی پر کلامِ الہی جس قدر اثر انداز ہوا ہے، اتنا وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

”اقبال کا ایمان چونکہ ”نومسلم“ کا سا ہے، خاندانی وراثت کے طور پر نہیں ملا ہے، اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف، تعلق اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعے اور تلاوت کا ذوق بہت زیادہ ہے۔“

قرآن کا پڑھنا عام کتابوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے، جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز فجر قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اقبال کے والد جب انہیں دیکھتے تو فرماتے ”کیا کر رہے ہو؟“ اقبال جواب دیتے: ”قرآن پڑھ رہا ہوں۔“ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایک دن اقبال نے پوچھا: ”ابا جان! آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں۔“ تو انہوں نے جواب دیا: ”میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے۔“ اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گزاری۔ قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے۔ نوجوانانِ ملت کے لئے وہ ایک پیغام چھوڑ گئے ہیں:

”میں اُس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں، جس گھر میں علی الصبح تلاوت

قرآن مجید کی آواز آئے۔ یعنی تلاوت ہو اور آواز کے ساتھ ہو۔“

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے غضب ہے سطر قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے!
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل بنایا ہے بُت پندار کو اپنا خدا تو نے
(بانگِ در: تصویر درد)

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جینوں سے بسایا ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

(بانگِ در: شکوہ)

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جینوں سے بسایا کس نے؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منظرِ فردا ہو؟

(بانگِ در: جواب شکوہ)

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلمان ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر!

(بانگِ در: جواب شکوہ)

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟ مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی تیرا مگر یہ حرفِ شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا؟
(بالِ جبریل: غزل 2)

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظ و پند!
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند
(بالِ جبریل: غزل 16)

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
وہی قرآن، وہی فرقاں، وہی یسین، وہی طاہا!
(بال جبریل: غزل 1)

جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
(بال جبریل: تن بہ تقدیر)

نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!
(ضرب کلیم: اجتہاد)

قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!
(ضرب کلیم: مرد مسلمان)

اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
(ضرب کلیم: اشتراکیت)

ہے وہی سرمایہ داری بندہٴ مومن کا دیں
(ارمغانِ حجاز: ابلیس "اپنے مشیروں سے")

وہ دانائے سبل، ختمِ الرسل، مولائے کل جس نے
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
حلقہٴ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان

جاننا ہوں میں، یہ اُمتِ حاملِ قرآن نہیں

عشقِ رسولؐ

عشقِ اقبال کی باطنی زندگی میں ارتقا پا کر عشقِ رسولؐ بن گیا ہے۔ جب وہ رسولِ کریم ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے اور اشعار خود بخود نعت کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹ پڑے ہیں۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است
شورِ عشقِ در نئے خاموشِ من می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
جوں جوں زندگی کے دن گزرتے گئے آنحضور ﷺ کے ساتھ اقبال کا عشق جنون کی صورت اختیار کرتا گیا، یہاں تک کہ آخری عمر میں جب بھی ان کی مجلس میں نبی کریم ﷺ کا ذکر آتا یا مدینہ منورہ کا ذکر ہوتا تو اقبال بے قرار ہو جاتے، آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں، آنسو رواں ہو جاتے، بعض اوقات تو ہچکیاں بندھ جاتیں۔ مدینہ کا نام آتے ہی پیانہ عشق لبریز ہو جاتا اور اشکِ محبت کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ وہ حج یا عمرے کے لئے بڑے بے تاب رہتے لیکن انہیں یہ سعادت جسمانی طور پر نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن انہوں نے ”ارمغانِ حجاز“ کے ایک باب بعنوان ”حضورِ رسالت“ میں آپؐ کو مخاطب کر کے اپنے ذاتی وارداتِ قلب اور امتِ مسلمہ کی دل گداز تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

اقبال کے اکثر و بیشتر اشعار میں عشقِ رسولؐ کی تب و تاب نمایاں ہے۔ یہاں چند اردو اشعار کے انتخاب کے علاوہ ”ارمغانِ حجاز“ کے اس حصے کا انتخاب (مع ترجمہ) شامل ہے جس میں اقبال حضورِ رسالتؐ روحانی طور پر پیش ہوتے ہیں۔

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
(بانگِ درا: ترانہ ملی)

دہر میں اہم محمدؐ سے اجالا کر دے
(بانگِ درا: جواب شکوہ)

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(بانگِ درا: جواب شکوہ)

صدیقؑ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس!
(بانگِ درا: صدیقؑ)

قبضے سے امت بے چاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی
(بانگِ درا: غزل)

مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
مگر یہ حرف شیریں ترجمہاں تیرا ہے یا میرا؟

(بالِ جبریل: غزل 2)

غبدِ رگ کو بخشا فروغِ ولویٰ سینا
وہی قرآنِ وہی فرقانِ وہی یسینِ وہی طلبا

(بالِ جبریل: نادر شاہ غازی)

مری دانش ہے فرنگی مرا ایمں ہے زندی!
(بالِ جبریل: غزل 14)

لبِ تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے!
آیاتِ الہی کا نگہبان کدھر جائے!
(ضربِ کلیم: اے روحِ محمدؐ)

روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

(ضربِ کلیم: ابلیس کا فرمان)

چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است
(ارمغانِ حجاز: حسین احمد)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

پردانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہو پیغام مرا

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا

وہ دانائے سُبُل، ختمِ الرسل، مولائے کُل جس نے
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اولِ وہی آخر

تُو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر!
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ!

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات

سرودِ برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
ہے مصطفیٰ برسوں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

حضور رسالت

اب جو اشعار پیش کئے جا رہے ہیں وہ علامہ اقبال کی لازوال تخلیق ”ارمغان حجاز“ کے اس باب سے ماخوذ ہیں جس کا عنوان ہے: ”حضور رسالت“۔ اس باب کا آغاز وہ عزت بخاری کے اس مشہور شعر سے کرتے ہیں۔

ادب گا پست زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(رسول کریم ﷺ کا شہر مدینہ یا روضہ مبارک ایک ایسی ادب گاہ ہے جہاں

حضرت جنید بغدادی اور حضرت بایزید بسطامی جیسے عظیم اولیاء بھی سانس گم کئے

ہوئے آتے ہیں کہ کہیں سانس لینا بھی بے ادبی میں شامل نہ ہو جائے۔)

شہر نبویؐ کو عزت بخاری کی زبان میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے بعد اقبال عالم خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر شروع کرتے ہیں اور اس تصور میں وہ قافلہ شوق کے ہمراہ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں۔ ذوقِ حضوری اور شوق و محبت میں یہ ریت ان کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے۔ اقبال ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است شبش کوتاہ و روز او بلند است

قدم اے راہرو آہستہ تر نہ چوما ہر ذرہ او دردمند است

(مدینے کے راستے کا صحرا کتنا اچھا ہے کہ اس کی شام صبح کی مانند مسکراتی ہوئی

ہے جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں کی رات چھوٹی اور دن

لبا ہے۔ اے راہی! اس صحرا کی ریت پر بڑی نرمی سے قدم رکھ کیونکہ اس کا ہر

ذرہ میری طرح دردمند ہے۔)

پھر اقبال اسی عالم خیال میں رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضر ہوتے

ہیں۔ درود و سلام پڑھتے ہیں۔ محبت و شوق کی زبان ان کے دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور وہ اس مبارک وقت اور سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا حال دل بیان کرتے ہیں۔ امت اور عالم اسلام کی حالتِ زار ان کے مسائل اور مشکلات، آزمائشیں اور امتحانات، نیز مغربی تہذیب و تعلیم اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے مسلمانوں کی بے بسی، اپنے وطن میں ان کی غریب الوطنی اور خود مسلمانانِ ہند میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔ کبھی ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور کبھی دل کی بات زبان پر آ جاتی ہے۔ اقبال کا یہ روحانی سفر اس زمانے میں ہوا جب ان کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ حج اور زیارات مقدسہ کی حسرت و تمنا ان کے دل میں جاگزیں تھی۔ لیکن ذوقِ سفر سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ جسمانی طور پر در رسولؐ تک پایادہ گئے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس وقت جبکہ میری زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے، اگر میں نے مدینہ منورہ کا قصد کیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ جس طرح شام کے وقت پرندے اپنے اپنے آشیانے (حقیقی مسکن) کی طرف جاتے ہیں، اسی طرح میری روح بھی اپنے حقیقی آشیانے کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔

بایں پیری رہِ یثرب گزتم نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ
(میں نے اس بڑھاپے میں یثرب کی راہ اختیار کی ہے۔ عاشقانہ نوا خوانی کی
مستی اور سرور میں چلا جا رہا ہوں، اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے
وقت اپنے گھونسلے کی فکر میں پرکھولتا ہے۔)

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جب اقبال کی اونٹنی اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ سوار بہت خستہ و بیمار ہے، لیکن اونٹنی ان کا مشورہ نہیں مانتی۔ وہ متانہ وار قدم تیز تر کرتی جاتی ہے، گویا یہ صحرا نہیں بلکہ ریشم کا نرم فرش
بچھا ہوا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
 قدم متانہ زد چنداں کہ گوئی پایش ریگ این صحرا حریر است
 (صبح کے وقت میں نے اونٹنی سے کہا کہ ذرا نرمی اور آہستگی سے چل۔ تجھ پر جو
 شخص سوار ہے وہ کمزور بیمار اور بوڑھا ہے۔ میں نے جتنا زیادہ اصرار کیا اس
 نے اتنا ہی قدم تیز تر کر دیئے کیونکہ وہ بھی جلوۂ رسول کا شوق رکھتی تھی۔ جب
 وہ چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صحرا کی ریت پر نہیں چل رہی بلکہ ریشمی
 کپڑے پر چل رہی ہے۔)

اب یہ کاروانِ مدینہ درود و سلام کی سوغات لئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں
 ہے۔ اس پر کیفِ فضا میں اقبال تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت پر ایک ایسا
 سجدہ میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لئے نقشِ دوام بن جائے۔ وہ اہلِ قافلہ کو بھی اسی سجدہ
 شوق کا مشورہ دیتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ دروے کارواں ہا درودے خواند و محمل براند
 بہ ریگ گرم او آور سجودے جبیں را سوز ، تا داغے بماند
 (کتنا اچھا ہے یہ صحرا جس میں قافلے والے درود پڑھتے جاتے ہیں اور محمل
 والے اونٹوں کو ہانکتے جاتے ہیں۔ اس صحرا کی گرم ریت پر سجدے کر۔ پیشانی
 کو اس کے سوز سے جلاتا کہ اس پر ایک داغ ہمیشہ کے لئے رہ جائے۔)

ذوق و شوق کا غلبہ ہوتا ہے تو عراقی اور جامی کے اشعار بے ساختہ ان کی زبان پر
 جاری ہو جاتے ہیں۔

گہے شعر عراقی را بخوانم گہے جامی زند آتش بجانم
 ندانم گرچہ آہنگِ عرب را شریکِ نغمہ ہائے ساربانم
 (کبھی میں فخر الدین عراقی کے شعر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی مولانا عبدالرحمن
 جامی کے شعر میری جان میں آگ لگاتے ہیں۔ اگرچہ میں عربوں کا آہنگ
 نہیں جانتا لیکن میں ساربان کے نغمے میں آواز سے آواز ملا کر شریک
 ہوں۔)

لوگ حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ عجیبی آخر کس زبان میں اشعار پڑھ رہا ہے جو

کچھ میں نہیں آتے لیکن دل کو درد و محبت سے اس طرح بھر دیتے ہیں کہ آدمی کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا اور پانی کے بغیر بھی اس کی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔

امیر کارواں! آں اعجمی کیست؟ سرود او باہنگ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابی او خنک دل در بیابانے توں زیست
(اے امیر کارواں! یہ تیرے قافلے میں کون عجمی ہے جس کا سرود جس کی لئے
عرب کے آہنگ سے جدا ہے۔ یہ ایسا نغمہ الاپ رہا ہے جس سے اس کا دل اس
بیابان میں گرمی کے باوجود سیرابی اور ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے۔)

راستے کی دشواریوں اور مشقتوں میں ان کو لطف آنے لگتا ہے۔ شب بیداری، کم
خوابی اور بے آرامی سے سرور حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس راستے کو طویل نہیں سمجھتے اور جلد
پہنچنے کی آرزو نہیں کرتے، بلکہ اپنے ساربان سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس
سے بھی زیادہ طویل اور دراز تر راستے سے لے چلے تاکہ اس بہانے سے ذوق و شوق
کی مدت بھی کچھ دراز ہو سکے اور انتظار کا لطف دو بالا ہو سکے۔

غم راہی نشاط آمیز تر گن فغانش را جنوں انگیز تر گن
گیر اے سارباں راہ درازے مرا سوز جدائی تیز تر گن
(اے ساربان! مجھ راہی کے غم کو زیادہ نشاط آمیز اور لذت خیز بنا۔ میری آہ و
فغان میں زیادہ جنوں پیدا کر۔ اے ساربان! کوئی لمبا راستہ اختیار کر۔ میرا
سوز جدائی اور تیز کر۔)

اسی سرور و شوق اور کیف و مستی کے ساتھ وہ سارا راستہ طے کرتے ہوئے مدینہ
منورہ پہنچتے ہیں اور اپنے رفیق سفر سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زلف کے اسیر
ہیں۔ آج ہم کو اپنے دل کی مراد بر لانے اور اپنے آقا اور محبوب کے قدموں پر اپنی
پلکیں بچھانے کا موقع ملا ہے، اس لئے آج ہمیں اپنی آنکھوں پر سے پابندی ہٹا لینی
چاہئے اور اس سیلاب اشک کو جو عرصے سے امنڈنے کے لئے بے چین ہے، تھوڑی
دیر کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔

یا اے ہم نفس باہم بنا لیم من و تو گشتہ شانِ جمالیم

دو حرفے بر مرادِ دلِ بگویم پپائے خواجہ پشماں را بما لیم!
 (آ اے میرے ہم نفس، ہم مل کر روئیں، کیونکہ میں اور تو، ہم دونوں اس کی
 شانِ جمالِ جلوۂ محبوب کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں اپنے دل کی مراد
 کے بارے میں کچھ کہیں اور روضہ رسول پر جا کر اپنے خواجہ کے پاؤں پر اپنی
 آنکھیں ملیں۔)

اقبال اپنے اوپر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیسی خوش نصیبی اور کیسا مقام
 مسرت ہے کہ یہ سعادت اور نعمت ان کے نصیب میں آئی اور اس درویش کو نااہلی کے
 باوجود اس دربارِ شاہی میں نوازا گیا جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور اورنگ نشینوں کو
 باریابی کی توفیق حاصل نہ ہو سکی۔

حکیمان را بہا کتر نہادند بنا داں جلوۂ مستانہ دادند
 چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے در سلطاں بہ درویشے کشادند!
 (یہاں مدینہ منورہ میں اہل عقل و حکمت کی بہت کم قیمت پڑتی ہے۔ یہاں تو ان
 نادانوں کو جلوۂ مستانہ سے نوازا جاتا ہے جو عشقِ رسول میں گم ہیں۔ میں کیسا
 خوش نصیب ہوں اور میری زندگی کیسی خوش و خرم ہے کہ مجھ جیسے درویش پر
 سلطان کے دروازے کھول دیئے گئے۔)

لیکن اس خوش نصیبی، سرور و مستی اور جذب و شوق میں بھی وہ امت مسلمہ اور عالم
 اسلامیہ کو فراموش نہیں کرتے اور پوری صدق دلی، صدق بیانی اور قادر الکلامی کے
 ساتھ ان کی حالتِ زار اور دردِ دل، کتاب کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔
 مسلمان آں فقیر کج کلاہے رمید از سینہ او سوز آہے
 دلش نالد چرا نالد؟ نداند نگاہے یا رسول اللہ نگاہے!
 (مسلمان جس کی شان یہ ہے کہ وہ فقیری میں بھی بادشاہ ہوتا ہے اور بے
 سر و سامانی میں بھی سوائے باری تعالیٰ کے ہر ایک سے بے نیاز ہوتا ہے وہ آج
 اپنی مسلمانی شان کھو چکا ہے۔ اس کے سینے میں اسلام کی حرارت ختم ہو چکی
 ہے۔ آج اس کا دل رورہا ہے۔ کیوں رورہا ہے؟ یہ اسے معلوم نہیں۔ یا رسول
 اللہ ﷺ! ایک نگاہِ کرم کہ اس کی تقدیر بدل جائے۔)

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ توست نوائے من ز تاثیرِ دمِ توست
 بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند ندیدم بندۂ کو محرمِ توست
 (میرے دل کی تب و تاب یا رسول اللہ تیرے سوزِ عشق کی وجہ سے ہے۔ میری
 شاعری میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ تیرے دم سے ہے۔ میں روتا اس لئے ہوں
 کہ ہندوستان میں میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو تیرا محرم ہو، تجھے جاننے
 اور پہچاننے والا ہو۔)

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست بایں خاک آفتابے را گزر نیست
 بما کن گوشہ چشمے کہ در شرق مسلمانے زما بیچارہ تر نیست
 (ہندوستان کے غلاموں کی شب کی سحر نہیں ہے۔ اس مٹی میں سورج کا گزر
 نہیں۔ ہماری طرف نگاہ کرم کر، کیونکہ مشرق میں ہندوستان کے غلام مسلمانوں
 سے زیادہ کوئی بے چارہ بے کس اور تنہا نہیں۔)
 اس امت کی بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہ بامِ بلند سے گری ہے اور جو جتنا اوپر سے
 گرتا ہے اتنی ہی زیادہ سخت چوٹ اسے آتی ہے۔

چہ گویم زان فقیرے درد مندے مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
 خدا ایں سخت جاں را یارِ بادا کہ افتاد است از بامِ بلندے!
 (میں اس درد مند فقیر یعنی مسلمان کے بارے میں کیا عرض کروں۔ کبھی یہ قیمتی گوہر
 ارجمند تھا۔ خدا اس سخت جان کا یار و مددگار ہو۔ یہ بہت اونچی چھت سے گرا ہے۔)
 علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس امت کی پریشانی بد حالی اور بے نظمی کی بڑی وجہ یہ
 ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں۔ افراد ہیں مگر نظام نہیں۔۔

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است ہنوز ایں کارواں دُور از مقام است
 زکارِ بے نظامِ او چہ گویم تُو می دانی کہ ملت بے امام است
 (مسلمانوں کے لئے یہ نیلا آسمان ابھی تک ٹیڑھی چال چل رہا ہے۔ مسلمانوں
 کا قافلہ ابھی تک اپنی منزل سے دور ہے۔ ان کی بے نظمی کے متعلق کیا عرض
 کروں۔ تُو جانتا ہے کہ یہ ملت بے امام ہے۔)

وہ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں اب وہ تب و تاب اور اس کے اندر مردم خیزی کی

وہ صلاحیت باقی نہیں رہی جو اس کا طرہ امتیاز تھا۔ اب عرصے سے اس کی نیام بے شمشیر اور اس کی ”کشت ویراں“ لالہ و گل سے محروم ہے۔

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش زوید لالہ از کشتِ خرابش
نیام او تہی چوں کیسہ او بطاقِ خانہ ویراں کتابش

(آج کے مسلمان میں وہ پہلی سی تب و تاب نہیں رہی۔ یہی سبب ہے کہ اس کے

ویراں کھیت میں لالہ و گل نہیں آگتے۔ اس کی نیام اس کی جیب کی طرح خالی

ہے۔ اس نے اپنی کتاب قرآن کسی ویراں گھر کے طاق میں رکھ دی ہے۔)

وہ کہتے ہیں کہ یہ امت اپنے سرمایہ آرزو اور ذوقِ جستجو سے محروم ہو کر رنگ و بو

میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس کے کان نرم و نازک نعموں کے خوگر ہو گئے ہیں اور مردانِ حُر

کی آواز اس کے لئے نامانوس ہو چکی ہے۔

دلِ خود را اسپر رنگ و بو کرد تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد

صفر شاہبازاں کم شناسد کہ گوشِ باطنینِ پشہ خو کرد

(آج کے مسلمان نے اپنے دل کو رنگ و بو کا اسیر کر لیا ہے۔ خود کو ذوق و شوق

اور آرزو سے خالی کر لیا ہے۔ وہ شاہبازوں کی آواز نہیں پہچانتا کیونکہ اس نے

اپنے کانوں کو چھری کی بھینٹا ہٹ سننے کا عادی بنا لیا ہے۔)

اب نہ اس کی آنکھ میں یقین کا نور اور عشق کا سرور ہے نہ اس کا دل کسی کی محبت

میں مخمور نہ اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے۔ وہ حضوری سے بہت دور اور منزلِ مقصود

سے نا آشنا اور مجبور ہے۔

بچم او نہ نور و نے سرور است نہ دل در سینہ او ناصبور است

خدا آں اُمّتے را یارِ بادا کہ مرگِ او زجانِ بے حضور است

(اس کی آنکھ میں نہ نور ہے اور نہ سرور ہے۔ نہ اس کے سینے میں بے قرار دل

ہے۔ اس امت کا خدا ہی یار و مددگار ہے کہ جس کی موت بے حضور جان سے

ہے یعنی اس کی زندگی ایسی ہے جس میں اس کا خدا پر یقین نہیں ہے۔)

پھر اقبال اس کے شاندار ماضی کا موازنہ اس کے داغ دار حال سے کرتے

ہیں۔ وہ بڑی بلاغت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس کو آپ نے بڑے لاڈ

پیارے پالاتھا اور ناز و نعم میں رکھا تھا، وہ آج ان صحراؤں میں اپنا رزق تلاش کرنے اور دبدر بھٹکنے پر مجبور ہے۔

پہرے ازمن کہ احوالشان چسان است زمینش بدگہر چوں آسمان است
برآں مرغی کہ پروردی بانجیر تلاش دانه در صحرا گران است
(مجھ سے مت پوچھئے کہ مسلمان کا کیا احوال ہے۔ اس کی زمین بھی آسمان کی
طرح بدگہر اور بد حال ہے، یعنی آسمان بھی اس کے موافق نہیں اور زمین بھی۔
اس پرندے پر جس کی پرورش آپ نے انجیریں کھلا کر کی ہے، صحرا میں دانه
تلاش کرنا بھاری ہو گیا ہے۔)

پھر اقبال رسول کریم ﷺ کے حضور لادینیت کے اس طوفان بلاخیز کا ذکر کرتے
ہیں جو عالم اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اقبال اچھی طرح سمجھتے تھے کہ
اسلامی ممالک میں لادینیت کا سب سے بڑا راستہ خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر روحانی
خلا اور قلب کی برودت ہے۔ سرفانہ زندگی سے اس میں اور مدد مل رہی ہے۔ وہ اس
بات پر یقین رکھتے تھے کہ لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفے کا مقابلہ
اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ زہد اور محبت ہے۔ اس پر اگر کوئی چیز غالب آ سکتی ہے تو
وہ حضرت ابو بکر صدیق کی زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے اس
مثالی زندگی کی آرزو کرتے ہیں جو زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر
ایسی زندگی وجود میں آ جائے تو ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کا احترام
کرنے پر مجبور ہوگی۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را ز آثار بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ با صدیق دادی بشورے آور ایں آسودہ جاں را
(عصر حاضر میں لادینیت نے جہاں کو تہ و بالا کر دیا۔ مادیت اس حد تک پھیل
چکی ہے کہ آج روح کو بھی جسم کے نشانات میں سے، یعنی جسم کی طرح مادی کہا جا
رہا ہے۔ اس فقیری سے جو آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو عطا کی تھی
مسلمان کی آسودہ اور آرام پسند زندگی میں ایک ولولہ اور شور پیدا کریں۔)

اقبال مسلمانوں کے زوال کا سبب غربت، وافلاس اور مادی وسائل کی کمی کو نہیں

سمجھتے، بلکہ اس کی توجیہ اس ”شعلہ زندگی“ کی افسردگی سے کرتے ہیں جو کسی زمانے میں ان کے سینے کے اندر فروزاں تھا۔ جب یہ درویش اور فقیر ایک اللہ کے لئے سجدہ ریز تھے اور کسی دوسرے کا اقتدار اور اختیار تسلیم نہیں کرتے تھے اس وقت شہنشاہوں کا گریبان ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن جب یہ شعلہ سرد ہو گیا تو ان کو درگاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لینی پڑی۔

فقیراں تا مسجد صف کشیدند گریبان شہنشاہاں دریدند
چوں آں آتش درون سینہ افسرد مسلماناں بدرگاہاں خزیدند!
(جب تک مسلمان جن میں فقیری کی شان تھی، مسجد میں صف آرا رہے وہ شہنشاہوں کے گریبان پھاڑتے رہے۔ جب فقر کی وہ آگ مسلمانوں کے سینوں میں بجھ گئی تو وہ خانقاہوں اور درگاہوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔)

مسلماناں بخویشاں در ستیزند بجز نقشِ دوئی بر دل نہ ریزند
بنا لندار کے نشتے بگیرد ازاں مسجد کہ خود از دے گریزند!
(مسلمان آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ اپنے دل پر نقشِ دوئی کے سوا کوئی نقش نہیں بنا رہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم شخص اس مسجد کی جس کے وہ کبھی نزدیک تک نہیں گئے، ایک اینٹ بھی اکھاڑ لیتا ہے تو وہ چیخ اٹھتے ہیں۔)

اقبال مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھتے ہیں۔ اس میں ان کو جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ایک مسلمان کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے۔ بہت سی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کو نبوتِ محمدیؐ اس کی تعلیمات، اس کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کو بہت سی مشرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، جابر و ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن سے ایک غیور اور خوددار انسان کی پیشانی مرق آلود ہونے لگتی ہے۔ اقبال خاموشی کے ساتھ ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں اور آخر میں بڑی صراحت، بلاغت اور اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان باتوں کے ساتھ ہم ہرگز آپ کے شایانِ شان نہ تھے۔ ہمارا آپ کی ذات سے

منسوب ہونا آپ کی شان میں بے ادبی ہے۔

جیسا کہ پیش غیر اللہ سودیم چو گبراں در حضور او سرودیم
 نالم از کئی نامی از خویش کہ ما شایانِ شان تو نبودیم
 (ہم نے اپنی پیشانی کو غیر اللہ کی چوکھٹ پر گھسایا۔ اس کے حضور بت پرستوں
 اور آتش پرستوں کی طرح اس کی عظمت کے گیت گائے۔ میں کسی سے نالاں
 نہیں ہوں۔ اپنے آپ سے نالاں ہوں کہ ہم آپ کے شایانِ شان نہ تھے۔)
 وہ عالمِ اسلام اور اسلامی ممالک پر احتیاطاً دوبارہ ایک نظر ڈالتے ہیں اور اپنے
 جائزے کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ ایک طرف خانقاہوں کا سبب خالی ہے دوسری طرف
 دانش گاہیں جدت و جرأت سے عاری ہیں۔ ان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ طے کئے
 ہوئے سفر کو بار بار طے کرتی رہیں۔ ادب و شعر مردہ و بے روح اور دلی جذبات سے
 محروم ہیں۔

سببِ خانقاہاں خالی از مے کند مکتب رہ طے کردہ را طے
 زبزمِ شاعراں افسردہ رتم نواہا مُردہ بیروں اُفتد از نے!
 (خانقاہوں کے پیالے معرفت کی شراب سے خالی ہیں۔ دینی مدرسے اس راہ
 کو طے کر رہے ہیں جو پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ میں آج کے شاعروں کی مجلس
 میں گیا اور بچھے ہوئے دل سے نکلا کیونکہ ان کی نوا مُردہ ہے۔)
 وہ کہتے ہیں کہ میں نے دنیائے اسلام کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن وہ مسلمان مجھے
 نہ ملا جو موت سے لرزہ بر اندام ہونے کی بجائے موت اس سے لرزہ بر اندام ہو اور جو
 خود موت کے لئے پیامِ موت ہو۔

ہاں بالے کہ بخشیدی پریدم بسوز نغمہ ہائے خود تپیدم
 مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزو جہاں گردیدم و او را ندیدم!
 (میں ان بال و پر سے اڑا جو تونے عطا کئے ہیں۔ میں اپنے نغموں کے سوز میں
 تڑپا۔ میں سارا جہان گھوما ہوں، لیکن مجھے وہ مسلمان کہیں نظر نہیں آیا جس سے
 موت کا پتی ہے۔)

علامہ اقبال مسلمانوں کی پریشاں خاطر کی آشفتمبری اور تنزلی کار از فاش کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی، محبت رکھتی ہے لیکن محبوب سے نا آشنا ہے وہ اطمینان اور دلجمعی سے ہمیشہ محروم رہتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ضائع ہوتی ہیں اور اس کی جدوجہد کبھی ایک منزل اور ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی۔

شبے پیش خدا بگر۔ ستم زار مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد، نمدانی کہ این قوم دلے دارند و محبوبے ندارند!

(میں ایک شب خدا کے سامنے بہت رویا کہ مسلمان کیوں زار و خوار ہیں۔ آواز آئی کہ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے لیکن محبوب نہیں رکھتی۔ یعنی اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ سے بالکل منقطع ہو گئی ہے۔)

لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات و مشکلات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بدل اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں بلکہ اس مایوسی، افسردگی، دوسروں پر اعتماد کرنے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرنے والوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں اور بڑے درد سے کہتے ہیں کہ حرم کے نگہبان بُت خانے کے پاسبان بن بیٹھے ہیں۔ ان کا یقین مُردہ و مضحل اور ان کی نگاہ مستعار اور اغیار کی رہن منت ہے۔

نگہبانِ حرم معمارِ دیر است یقینش مُردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہ او تو اں دید کہ نومید از ہمہ اسبابِ خیر است
(وہ مسلمان جسے حرم کا محافظ ہونا چاہئے تھا بُت کدے کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔
اس کا یقین و ایمان مُردہ ہو چکا ہے اور اس کی نگاہ غیر اللہ پر لگی ہوئی ہے۔ اس کی نگاہ کے انداز سے دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ خیر و خوبی کے تمام اسباب سے ناامید ہو چکا ہے۔)

اقبال اپنا اور اپنے زمانے کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ برس پر پیکار ہیں اور جو قدم قدم پر ان کے لئے ایک مستقل آزمائش اور امتحان ہے۔

گے اتم، گے مستانہ خیزم چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہ التفاتے بر سر بام کہ من باعصر خویش اندر ستیزم!
(کبھی میں گرتا ہوں اور کبھی مستانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا خون ہے جو میں بغیر تیغ و تلوار کے بہا رہا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میرے پاس قوت اور

وسائل تو نہیں، لیکن پھر بھی میں اپنے بے دین زمانے کے خلاف لڑ رہا ہوں۔
اے محبوب! چھت پر سے ایک نگاہِ التفات مجھ پر ڈال کہ میں اپنے زمانے سے
جنگ کر رہا ہوں۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصرِ حاضر سے کشمکش میں گزری۔
انہوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفے کا نہ صرف انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر اس پر سخت
تقصید بھی کی۔ اس کو چیلنج کیا اور بڑی جرأت، روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا
ثابت کیا اور اس پردہٴ فریب کو چاک کیا جس نے اس کی اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں
سے چھپا رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربی، یقین و خود اعتمادی اور اسلامی شخصیت
کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی طرزِ فکر کے زبردست منکر تھے۔ ان
کو یہ کہنے کا حق حاصل تھا کہ۔

چو رومی در حرم دادم اذناں من ازد آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنہٴ عصرِ کہن، او بہ دورِ فتنہٴ عصرِ رواں من
(میں نے جلال الدین رومی کی طرح حرم میں اذان دی۔ میں نے اس سے
زندگی کے اسرار و رموز سیکھے۔ پرانے زمانے کے فتنے کے وقت وہ موجود تھے
اور عصرِ حاضر کے فتنے کے وقت میں موجود ہوں۔)

مسلمان تا بسائل آرمید است نجل از بحر و از خود ناامید است
جز ایں مردِ فقیرے درد مندے جراحات ہائے پنہانش کہ دید است؟
(مسلمان جب سے عملی زندگی کے سمندر سے ہٹ کر ساحل پر آرام کرنے لگا
ہے، سمندر سے شرمندہ اور اپنی ذات سے ناامید ہے۔ سوائے اس درد مند مردِ
فقیر کے، اس کے خفیہ زخموں کی جراحات کا طریقہ کے معلوم ہے۔ یعنی مسلمانوں
کے دکھ درد کو جس طرح میں نے سمجھا ہے، اور اس کے زخموں کا علاج جس طرح
میں نے کیا ہے، کوئی اور کیا کرے گا!)

اقبال مغربی تہذیب و علوم سے اپنی بغاوت، ان کے جال سے بچ نکلنے اور اپنے
عقیدہ و ایمان اور اپنی روایات و اقدار کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے بڑا قلندرانہ دعویٰ
کرتے ہیں کہ انہوں نے مغربی فلسفہ و تہذیب کے آتشِ نمرود میں شانِ ابراہیمی کا

مظاہرہ کیا۔ وہ فخر و مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انہوں نے ان علوم کا مغز حاصل کر لیا اور پوست پھینک دیا۔ یہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ اس کے جال سے باہر بھی آ گئے اور اس کا طلسم ہو شر با پاش پاش کر دیا، جس نے مشرق و مغرب دونوں کی نظر بندی کر رکھی ہے۔

طلسم علم حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامن کستم
خدا داند کہ مانند براہیم بہ ناری او چہ بے پروا نشستم!
(میں نے عصر حاضر کے علوم کا طلسم توڑا۔ میں نے اس کے جال سے دانہ تو
چن لیا اور اس کا جال توڑ دیا۔ خدا جانتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی طرح میں بھی
موجودہ زمانے کی آگ میں بے پروا ہو کر بیٹھا۔)

وہ اپنی اس زندگی کا ذکر کرتے ہیں جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گزری تھی اور جہاں خشک و افسردہ کتابوں، دقیق فلسفیانہ مباحث، فتنہ انگیز حسن و جمال اور دل آویز خوشنما مناظر کے سوا انہیں اور کچھ نہ مل سکا۔ اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی، جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کر دینا چاہا۔

بہ افرونگی بتاں دل باختم من زتاب دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتم بیگانہ بودم چو دیدم خویش را شناختم من
(میں نے فرونگی بتوں کے پاس دل ہار دیا۔ میں بت پرستوں کی حرارت سے
پگھل گیا۔ میں اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ ہو گیا کہ جب میں نے خود کو دیکھا
تو پہچان نہ سکا۔)

اب بھی جب ان کو یورپ کے قیام کے دن اور ان دنوں کی ویرانی و بے نوری یاد آتی ہے تو ان کی طبیعت پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ مے خانہ مغرب میں بیٹھ کر مجھے سوائے در دسر کے اور کچھ نہ ملا۔ اس سے زیادہ بے سوز، بے نور اور بے کیف شب و روز مجھے اپنی پوری عمر میں یاد نہیں، جو ان دانشمندانِ فرنگ کے ساتھ گزرے۔

مے از میخانہ مغرب چشیدم بجان من کہ درو سر خریدم

نشتم با نکویان فرنگی ازاں بے سود تر روزے ندیدم!
 (میں نے مغرب کے میخانے سے شراب پی۔ مجھے اپنی جان کی قسم میں نے دردِ
 سر مول لیا۔ میں یورپ کے فلسفیوں اور مدبروں کے ساتھ بیٹھا۔ میں نے اس
 سے بڑھ کر بے سوز و بے کیف دن نہیں دیکھے۔)

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں، میں تو آپ کے ایک فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں۔
 اہلِ خرد اور اہلِ دانش کی یہ ساری نکتہ آفرینیاں اور لن ترانیاں میرے لئے درد کا
 سامان اور وبالِ جان ہیں۔ میں تو صرف آپ کے در کا فقیر ہوں۔ آپ کی گلی کا سائل
 ہوں۔ مجھے کسی کے سنگ آستان پر سر پھوڑنے اور قسمت آزمانے کی کیا ضرورت ہے!
 فقیرم از تو خواہم ہرچہ خواہم دل کو ہے خراش از برگ کاہم
 مرا درسِ حکیمان دردِ سر داد کہ من پروردہ فیضِ نگاہم!
 (میں فقیر ہوں۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں، آپ سے چاہتا ہوں۔ میں گھاس کا تنکا
 ہوں۔ اس سے پہاڑ کے دل میں خراش پیدا کر۔ مجھے اہلِ خرد و حکمت کے درس
 نے دردِ سردیا کیونکہ میں آپ کے فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں۔)

پھر اقبال اس طبقے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو دین اور علم دین کا نمائندہ سمجھا
 جاتا ہے۔ وہ اس کی خشکی، جمود، محبت اور سوزِ دروں سے محرومی، معلومات کی گرم بازاری
 اور اصطلاحات کی گراں باری کا شکوہ کرتے ہوئے بڑے شاعرانہ اور بلیغ انداز میں
 کہتے ہیں کہ اس کا صحرائے جاز زم زم سے خالی اور بیت اللہ سے محروم ہے۔ وہ کہتے
 ہیں کہ جاز کے ریگستان کی قیمت تو بیت اللہ اور آب زم زم سے ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو
 ان پتے ہوئے بیابانوں اور خاموش پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ اسی طرح وہ عالم دین کتنا
 مفلس و نادار ہے جو علم وافر زبانِ گہرا فشاں اور ذہن رساں کا مالک ہے، لیکن اس کی
 آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل کی ایک تڑپ سے بھی نا آشنا ہے، جس کے حصے میں
 اس سر زمین مقدس کی صرف سختی اور گرمی آئی ہے، خشکی اور نمی نہیں آئی۔

دل مٹا گرفتار غم نیست نگاہے ہست در چشمش غم نیست
 ازاں بگر ختم از ملک او کہ در ریگ جازش زمزم نیست!

(ملاغم عشق میں گرفتار نہیں ہے۔ اس کے پاس نگاہ تو ہے، لیکن آنکھ میں آنسو نہیں ہے۔ میں اس کے کتب سے اس لئے بھاگا کیونکہ اس کے حجازی ریگ میں آب زم زم نہیں ہے۔ یعنی وہ دین کی باتیں تو ضرور کرتا ہے، لیکن اس میں خلوص اور سوز نہیں ہوتا۔)

وہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے غیر اللہ پر بھروسا کیا اور اس کی سزا میں دو سو مرتبہ اپنے مقام سے نیچے گرایا گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں زور شمشیر کام آتا ہے نہ حسن تدبیر۔ یہ تقدیر الہی اور مشیت ایزدی کا مقام ہے اور یہاں قدم کی ایک لغزش آدمی کو بہت نیچے گرا سکتی ہے۔

دل خود را بدست کس ندادم گرہ از روئے کار خود کشادم
 بہ غیر اللہ کردم تکیہ یک بار دو صد بار از مقام خود فکادم
 (میں نے اپنا دل کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ میں نے اپنے چہرے پر پڑی ہوئی
 گرہ کو خود کھولا۔ میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسا کیا تھا۔ اس کی پاداش میں
 اپنے مقام سے دو سو مرتبہ گرایا گیا ہوں۔)

اقبال کہتے ہیں کہ اس بے سوز اور بے اخلاص عہد میں جو منفعت و مصلحت کے سوا
 کسی اور چیز سے آشنا نہیں اور جس کا مصنوعی یا حیوانی دل ہر قسم کے لطیف احساسات
 اور مخلصانہ جذبات سے عاری ہے، میرے لئے سوزِ دروں کی آگ میں جلنے اور خون
 جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔

نگاہم زانچہ پنم بے نیاز است دل از سوزِ درونم در گداز است
 من و این عصر بے اخلاص و بے سوز! بگو با من کہ آخر این چہ راز است؟
 (میری نگاہ جو کچھ ظاہر میں دیکھتی ہے، میں اس سے بے پروا ہوں۔ میرا دل
 میرے سوزِ دروں سے پگھلا ہوا ہے۔ میں ہوں اور یہ بے اخلاص اور بے سوز
 زمانہ۔ مجھے بتا، آخر یہ کیا راز ہے؟)

وہ کہتے ہیں، مشرق و مغرب کسی بھی جگہ میرا کوئی ہمد و ہمزاز نہیں۔ میں اپنا غم دل
 اپنے ہی دل سے کہتا ہوں اور اپنے آپ کو بہلاتا ہوں۔
 من اندر مشرق و مغرب غریم کہ از یاران محرم بے نصیم

غم خود را بگویم با دل خویش چه معصومانہ غربت را فرسیم!
 (میں مشرق اور مغرب ہر جگہ اجنبی ہوں۔ میں اپنے ہم دم و ہم ساز دوستوں
 سے بے نصیب ہوں۔ اپنا غم اپنے دل ہی سے کہتا ہوں۔ میں کس معصومیت
 سے اپنی اجنبیت کو فریب دے رہا ہوں۔)

اقبال کو شکایت یہ ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا
 اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا۔ انہوں نے شاعری میں جس سروشِ غیب کی
 ترجمانی کی اس پر کسی نے کان نہ دھرا۔ سب ان کو ترجمانِ حقیقت کی بجائے محض غزل
 گو اور غزل خواں سمجھتے رہے۔

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند ز شاخِ نخلِ من ثرما نخوردند
 من اے میر اُم داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند
 (وہ راز جو میں نے مسلمانوں سے بر ملا کہہ دیا اس پر وہ چلے نہیں۔ انہوں نے
 میرے کھجور کے درخت کا پھل نہیں کھایا۔ اے امیر ام حضرت محمد ﷺ! میں
 اپنے کلام و پیام کی تحسین حضور ﷺ سے چاہتا ہوں۔ میرے احباب نے تو
 مجھے محض غزل گو شاعر سمجھ رکھا ہے۔)

اقبال رسولِ کریم ﷺ سے شکایت کرتے ہیں کہ آپ کا حکم اور فرمان تو یہ ہے
 کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقائے دوام کا پیغام پہنچاؤں، لیکن یہ ناحق شناس مجھ سے یہ
 مطالبہ کرتے ہیں کہ عام شاعروں کی طرح میں بھی لوگوں کی تاریخِ وفات نکالتا اور قطعہ
 تاریخ کہتا رہوں۔

تو گفتمی از حیات جاوداں گوئے بگوشِ مردہ پیغام جاں گوئے
 ولے گویند این ناحق شناساں کہ تاریخِ وفات این و آں گوئے!
 (حضور ﷺ! آپ کا فرمان ہے کہ حیاتِ جاوداں کی بات کروں، مردہ دل
 لوگوں کے کان میں زندگی کا پیغام ڈال دوں، لیکن ناحق شناس لوگ مجھ سے
 کہتے ہیں کہ لوگوں کے مرنے پر تاریخِ وفات کہا کرو، قطعہ تاریخ لکھا کرو۔)
 اقبال بڑے درد و سوز اور بڑی حسرت اور تلخی کے ساتھ اس بات کی شکایت
 کرتے ہیں کہ وہ علم اور وہ پیغام جو ان کے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے اس سے

لوگوں کو دلچسپی نہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بڑی قناعت اور زہد کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اپنی ساری متاع کھول کر میں نے بازار میں رکھ دی، لیکن کوئی اس جنس نایاب کا خریدار نہ ملا۔ میں نے ارمغانِ دل پیش کرنا چاہا، لیکن اس کا بھی کوئی قدر داں نظر نہ آیا۔ مجھ سے زیادہ غریب الوطن، بیگانہ اور تنہا اس دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔

دلے برف نہادم، دلبرے نیست متاعِ داشتہ، غارت گرے نیست
 درونِ سینہ من، منزله گیر مسلمانے زمن تنہا ترے نیست!
 (یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اپنا دل اپنی ہتھیلی پر رکھا کہ ہے کوئی لے جانے والا، لیکن اس کو لے جانے والا کوئی نہیں۔ میرے پاس دولت تھی، لیکن میری دولت کو لوٹنے والا کوئی نہ تھا۔ یا رسول اللہ ﷺ! آپ میرے سینے میں قیام فرمائیے۔ مسلمان ہوں، مجھ سے زیادہ تنہا اور کوئی نہیں ہے۔)

مؤمن

خودی، فقر اور عشق جس شخص میں جمع ہوں گے وہ اقبالیات کی اصطلاح میں ”مؤمن“ کہلائے گا۔ اقبال اپنی ایک فارسی غزل میں ”مؤمن“ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: تجھ پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تجھ سے روشن ہیں، لیکن تیری ذات ہی درمیان سے غائب ہے۔ تم کب تک غفلت، گنہامی و جہالت کی زندگی گزارتے رہو گے۔ تمہاری روشنی نے دنیائے قدیم کو روشن کیا اور تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لئے منارۂ نور بن کر رہا۔ تمہاری آستین میں ہمیشہ ید بیضا موجود رہا۔ تم آج گھر و دندوں میں گھوم رہے ہو، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تم انہیں پھلانگ بھی سکتے ہو۔ تم تو اس وقت بھی تھے جب یہ کائنات نہ تھی اور اس وقت بھی رہو گے، جب یہ نہ ہو گی۔ اے مردِ مؤمن! تو موت سے ڈرتا ہے، حالانکہ موت کو تجھ سے ڈرنا چاہئے۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ آدمی کی موت روح کی جدائی سے نہیں ہوتی بلکہ ایمان کی کمی اور یقین سے محرومی کے باعث ہوتی ہے۔

اے مردِ مؤمن! تو ناموسِ ازل کا امین و پاسباں اور خدائے لم یزل کا رازداں ہے۔ تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے، لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے۔ میخانہ یقیں سے پی اور ظن و تخمین کی پستیوں سے نکل کر بلند ہو جا۔ فرنگ کی دل آویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد، جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنا دیا ہے۔ فریادان بازی گروں سے جو کبھی ناز و ادا سے پکڑتے ہیں اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں، کبھی شیریں کا کردار ادا کرتے ہیں اور کبھی پرویز کا روپ بھرتے ہیں۔ دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویران ہو گئی ہے۔

اے مردِ مؤمن! اے بانیِ حرم! اے معمارِ کعبہ! اے فرزندِ ابراہیم! ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بیدار ہو۔

اے غنچہ خوابیدہ چو زگس نگرماں خیز
 کاشائے ما رفت بتاراجِ عمال خیز
 از نالہ مرغِ چمن از بانگِ اذال خیز
 از گرمی ہنگامہ آتشِ نفساں خیز!
 از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز!

”مؤمن“ سے متعلق اردو اشعار کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بندۂ مؤمن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے!
 (بانگِ درا: سید کی لوحِ تربت)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
 کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
 یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
 جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
 (بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

عالم ہے فقط مؤمن جانناز کی میراث
 مؤمن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے
 (بالِ جبریل: غزل 10)

کافر ہے مسلمان، تو نہ شاہی نہ فقیری
 کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
 کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلمان
 مؤمن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی!
 مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!
 مؤمن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الہی!
 (بالِ جبریل: غزل 12)

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
 تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
 زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
 جہاں تمام ہے میراثِ مردِ مؤمن کی
 دماغِ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
 وگرنہ آگ ہے مؤمن جہاں خس و خاشاک
 کے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک
 مرے کلام پہ حجت ہے نکتہ لولاک!
 (بالِ جبریل: غزل 46)

نہ مؤمن ہے نہ مؤمن کی امیری
 رہا صوفی، گئی روشن ضمیری

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری!
(بال جبریل: رباعی)

تجھ سے ہوا آشکار بندہ مؤمن کا راز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مؤمن کا ہاتھ
خاک کی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو
نقطہ پرکار حق ، مرد خدا کا یقین
عقل کی منزل ہے وہ ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

(بال جبریل: مسجد قرطبہ)

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
شہادت ہے مطلوب و مقصود مؤمن
دل مرد مؤمن میں پھر زندہ کر دے
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی!
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!
وہ بجلی کہ تھی نعرہ لا تَذُرْ میں!
نگاہِ مسلمان کو تلوار کر دے
(بال جبریل: طارق کی دعا)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نہ ہونو امید نو امید زوالِ علم و عرفاں ہے
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
امید مرد مؤمن ہے خدا کے راز دانوں میں
(بال جبریل: ایک نوجوان کے نام)

یہ سحر جو کبھی فردا ہے ، کبھی ہے امروز
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
ہوتی ہے بندہ مؤمن کی اذائے پیدا
(ضربِ کلیم: صبح)

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!
 خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مؤمن!
 جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مؤمن!
 خوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مؤمن!
 (ضربِ کلیم: مؤمن)

گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان!
 یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
 ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشان!
 قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!
 دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان!
 دریاؤں کے دل جس سے دل جائیں وہ طوفان!
 آہنگ میں یکتا صفتِ سورۃ رحمن!
 لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان!
 (ضربِ کلیم: مردِ مسلمان)

یہ مسئلہ مشکل نہیں، اے مردِ خردمند
 ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
 مؤمن فقط احکامِ الہی کا ہے پابند
 (ضربِ کلیم: احکامِ الہی)

مردِ مؤمن کی نگاہ غلط انداز ہے بس!
 (ضربِ کلیم: محرابِ گل افغان کے افکار)
 ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
 مؤمن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ
 (ارمغانِ حجاز: بیڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)
 زمین سے تا بہ ثریا تمام لات و منات!
 نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات
 (ارمغانِ حجاز: مسعود مرحوم)

ہو حلقہٴ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
 افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
 جتھے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
 کہتے ہیں فرشتے کہ دلاویز ہے مؤمن

ہر لحظہ ہے مؤمن کی نئی شان، نئی آن
 قہاری و غفاری و قدسی و جبروت
 ہمسایہٴ جبریل امیں بندۂ خاکی
 یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
 قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
 جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
 فطرت کا سرود ازیلی اس کے شب و روز
 بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم

پابندیِ تقدیر کہ پابندیِ احکام؟
 اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
 تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

پرورشِ دل کی اگر مد نظر ہے تجھ کو

اللہ کو پامردیِ مؤمن پہ بھروسا
 تقدیر اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا

مقامِ بندۂ مؤمن کا ہے ورائے سپر
 حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی

حدیث بندۂ مؤمن دل آویز جگر پُرخوں، نفس روشن، نگہ تیز!
میر ہو کے دیدار اس کا کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز!
(ارمغانِ حجاز: رباعی)

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب دیں بندۂ مؤمن کے لئے موت ہے یا خواب
(ارمغانِ حجاز: ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

شاہین

اقبال کے ہاں مردِ مؤمن، نوجوان، فرزندِ کہستانی، نئی نسل یا نژادِ نو کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے ”شاہین“ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے مثالی نوجوان کو عموماً شاہین کہہ کر پکارا ہے۔ اس لئے کہ ایک مثالی نوجوان میں اقبال جس قسم کے اوصاف دیکھنے کے آرزو مند ہیں وہ انہیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔ اقبال نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ”شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فکر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خود دار و غیرت مند ہے، کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے۔ چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین (جرۂ شاہین، شاہینِ کافوری، باز، جرۂ باز اور عقاب وغیرہ) کی صفات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس ذکر سے اُن کی مراد نوجوانوں ہی کی سیرت و کردار سے ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نوا پیرا ہواے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا!
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے مسلمان سے حدیث سوز و سازِ زندگی کہہ دے
(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں کہ شاہین کے لئے ذلت ہے کارِ آشیانہ بندی!
(بالِ جبریل: غزل 10)

وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کر گسوں میں اسے کیا خیر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
(بالِ جبریل: غزل 13)

سہل شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا!
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا!
(بال جبریل: غزل 8)

یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے گلاہ!
(بال جبریل: غزل 23)

یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا!
بڑی مدت کے بعد آخروہ شاہیں زیر دام آیا!
(بال جبریل: غزل 35)

چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!
ترے سامنے آساں اور بھی ہیں
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
(بال جبریل: غزل 40)

فروغ دیدہ افلاک ہے تو
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو
(بال جبریل: رباعی)

پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پد دے
مرا نور بصیرت عام کر دے
(بال جبریل: رباعی)

گنجشک فرمایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جو نقش کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو
(بال جبریل: فرمان خدا)

تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں!
(بال جبریل: ایک نوجوان کے نام)

اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں!

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندان کتب سے
بہت مدت کے نچھیلوں کا انداز نگہ بدلا

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
ٹو شاہیں ہے، پرداز ہے کام تیرا
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا

ترا جوہر ہے ثوری پاک ہے تو
ترے صید زبوں انفرشتہ و حور

جوانوں کو مری آہ سحر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے

گرماد غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سال خورد

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگلیں!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں
(بال جبریل: نصیحت)

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!
(بال جبریل: حال و مقام)

دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!
(بال جبریل: ابوالعلمتری)

جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ!
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ!

نہ بیماریِ نغمہ عاشقانہ!
ادا میں ہیں ان کی بہت دلبرانہ!

جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ!
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ!

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ!

کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!
(بال جبریل: شاہین)

پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد!
(ضرب کلیم: اسرارِ پیدا)

پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات!
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات!

(ضرب کلیم: ہندی مکتب)
اربابِ نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز

کہہ دے کوئی اُلو کو اگر ”رات کا شہباز“
(ضرب کلیم: خوشامد)

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر

پرداز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو

نہ بادِ بہاری، نہ گل چیں، نہ بلبل
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں

’بھٹنا‘ ’پلٹنا‘ ’پلٹ کر جھپٹنا‘
یہ پورب، یہ پچھتم، چکوروں کی دنیا

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
شاہیں کبھی پرداز سے تھک کر نہیں گرتا

بہتر ہے کہ بے چارے مولوں کی نظر سے
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال

میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ، لیکن
کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد
معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت

زاع کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے ہر
 لیکن اے شہباز! یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
 ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
 شہرک کہتی ہے تجھ کو کورچشم و بے ہنر
 ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر!
 روح ہے جس کی دم پرواز، سرتا پا نظر!
 (ضربِ کلیم: محرابِ گل افغان کے افکار)
 زاعِ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرخ
 کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
 (ارمغانِ حجاز: ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

علم و عقل

علم اور چیز ہے، تعلیم اور چیز ہے۔ اقبال علم و حکمت و عقل کے مد مقابل یا ان سے بھی
 بالاتر عشق کو خیال کرتے ہیں۔ یایوں سمجھئے کہ علم کو عشق کے تابع خیال کرتے ہیں۔ وہ معرفت
 اور عرفان کے قائل ہیں اور حصولِ علم کا مقصد بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ عالم کو عرفانِ ذات
 حاصل ہو جائے۔

علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے، تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
 علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
 (بانگِ درا: عقل و دل)

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن، گو ہر بدست
 دوائے محرومی! خرف چہین لبِ ساحل ہوں میں
 (بانگِ درا: غزل)

ہر مسلمان رگِ باطل کے لئے نشتر تھا اس کے آئینہ ہستی میں عمل جو ہر تھا
 جو بھروسا تھا اسے، قوتِ بازو پر تھا ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو

پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!

(بانگِ درا: جوابِ شکوہ)

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری یہ سب کیا ہیں؟ نقطہ اک نکتہ ایمان کی تفسیریں
 براہی نظر پیدا، مگر مشکل سے ہوتی ہے ہوں چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!
ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!
(بال جبریل: غزل 8)

آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں
یہ وہ جنت ہے جس میں خور نہیں
(بال جبریل: غزل 20)

اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل!
(بال جبریل: غزل 42)

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مسادات!
(بال جبریل: لینن "خدا کے حضور میں")

علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!
علم را بر دل زنی یارے بود
(بال جبریل: پیر و مرید)

کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟
عشق و رقت آید از نانِ حلال
(بال جبریل: پیر و مرید)

محبت کی رسمیں نہ ترکی، نہ تازی!
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی!
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی!
(بال جبریل: محبت)

عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین وطن!
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!
(بال جبریل: علم و عشق)

نہیں ہے قطرہ شبنم اگر شریکِ نسیم
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!
(ضربِ کلیم: علم اور دین)

عشق کی تیغِ جگر دار اڑالی کس نے؟
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخنِ عینِ حیات

دل بیٹا بھی کر خدا سے طلب
علم میں بھی سرور ہے لیکن

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت!

چشمِ بیٹا سے ہے جاری جوئے خوں
علم را برتن زنی مارے بود

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟
علم و حکمت زاید از نانِ حلال

شہیدِ محبت نہ کافر، نہ غازی!
وہ کچھ اور شے ہے، محبت نہیں ہے
یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے

علم نے مجھ سے کہا، عشق سے دیوانہ پن!
بندۂ تخمین وطن! کرم کتابی نہ بن!

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے
 علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
 زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ
 ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
 (ضربِ کلیم: تربیت)

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
 ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
 جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو!
 اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تنگ و دو
 شام اس کی ہے مانندِ سحر صاحبِ پر تو!
 (ضربِ کلیم: محرابِ گل افغان کے افکار)

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت
 اللہ! ترا شکر کہ یہ خطہٴ پُرسوز
 جو کچھ ہے، وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد!
 سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد!
 (ارمغانِ حجاز: دوزخی کی مناجات)

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا
 خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟
 زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضا ہے گردوں ہے بے کرانہ
 عمل سے فارغ ہوا مسلمان، بنا کے تقدیر کا بہانہ
 (ارمغانِ حجاز: ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

مغربی تعلیم

اقبال جدید مغربی تعلیم کے سخت خلاف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم ہمارے نوجوانوں میں تعطل، جمود، آرام طلبی اور لذت کوشی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو بحر منجمد بنا دیتی ہے۔ جدید تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کے مستقبل کے لئے نوآبادیات کی زمین ہموار کرتی ہے اور نوجوانوں کو مغرب زدہ بناتی ہے اور بلند معیار زندگی اور اقتصادی ترقی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتی ہے۔ مغربی تعلیم کفر و الحاد پھیلاتی ہے۔ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ کا باعث ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں، بلکہ وہ یورپ (اور اب امریکہ) کی پرچھائیں ہے اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچا ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے، لیکن اس میں روح نہیں ہے۔ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے اور یہ اسلامی طرز فکر و تعلم کی نفی ہے۔ اسلام کا جو ہر ذاتِ باری تعالیٰ بلکہ اس کی توحید میں ہے۔ اگر ہمارے نوجوانوں کی تعلیم سے یہ نکتہ توحید ہی خارج کر دیا جائے تو انسان محض مٹی کا پیکر رہ جاتا ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں
 و انہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
 (بانگِ درا: سید کی لوحِ تربت)

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
 ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغتِ تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
 (بانگِ درا: تعلیم اور اس کے نتائج)

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر! لازم ہے رہرو کے لئے دنیا میں سامانِ سفر
 اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا ہے خونِ فاسد کے لئے تعلیم مثلِ نیشتر

واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر
یک لحظہ غافلِ گشتم و صد سالہ را ہم دور شد
(بانگِ در: مسلمان اور تعلیمِ جدید)

ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انعاش
ہر چند عقلِ کل شدہ بے جنوں مباحش
(بانگِ در: مذہب)

دنیا میں اب رہی نہیں تلوارِ کارگر
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر!
کہتا ہے کون اسے کہ مسلمان کی موت مر!
دنیا کو جس کے پنجہ خونیں سے ہو خطر
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر!
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر؟
(ضربِ کلیم: جہاد)

قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش!
زندگی موت ہے کھودیتی ہے جب ذوقِ خراش!
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش!
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش!
(ضربِ کلیم: مدرسہ)

اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!

رہبر کے ایما سے ہوا، تعلیم کا سودا مجھے
رہتم کہ خار از پاکشتم، محل نہاں خد از نظر

تعلیم پر فلسفہ مغربی ہے یہ
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
محسوس پر بناء ہے علومِ جدید کی
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
باہر کمال اند کے آشفگی خوش است

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
تیغ و تفنگ دستِ مسلمان میں ہے کہاں
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
تعلیم اس کو چاہئے ترکِ جہاد کی
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
ہم پوچھتے ہیں شیخ کھلیسا نواز سے
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے کیا بیگانہ
فیضِ فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر

عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام!

(ضرب کلیم: عصر حاضر)

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں!

(ضرب کلیم: طالب علم)

کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی جگ و دو!

وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

(ضرب کلیم: اساتذہ)

اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ!

نہیں ہے بندۂ خُر کے لئے جہاں میں فراغ!

صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

(ضرب کلیم: غزل)

ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف

ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف!

قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف!

کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!

(ضرب کلیم: دین و تعلیم)

تعلیم ہو گو فرنگیانہ!

(ضرب کلیم: جاوید سے)

ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!

سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

(ضرب کلیم: نصیحت)

ستم ہے خوار پھرے دشت و در میں دیوانہ!

کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ!

کہ اس کے واسطے لازم نہیں ہے دیرانہ!

(ضرب کلیم: جنوں)

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت

لے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے

فطرتِ افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے

جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو

تاثر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب

زجاج گر کی دکانِ شاعری و ملائی

کے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں

ہجومِ مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو

اے شیخ بہت اچھی کتب کی فضا لیکن بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی!
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی!
(ضرب کلیم: غزل 20)

مغربی تہذیب

مغرب کی مادی تہذیب اور اس کی پیدا کردہ مشکلات اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال اپنی تصنیف ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ میں لکھتے ہیں:

”حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں، ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست و گریباں ہیں۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین ہوس زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب و اقدار کے لئے مغربی تہذیب کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ بہر حال یہ وطنیت ہو یا لادینی اشتراکیت، دونوں مجبور ہیں کہ ہر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصے پر اکسائیں، حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی، وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہمی مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی مہیب اور غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، نہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔“

دیار مغرب میں رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زیرِ کم عیار ہوگا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

(بانگِ درا: مارچ 1907ء)

حرارت ہے بلائی، بادۂ تہذیب حاضر میں
 کیا ذرہ کو بگنودے کے تاب مستعار اس نے
 نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
 تغیر آ گیا ایسا تدبیر میں، تخیل میں
 کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیانہ لیکن
 حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
 فروغ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
 ”تو اے پروانہ! اس گرمی نہ شمعِ محفلے داری
 چوں در آتشِ خود سوز، اگر سوزِ وے داری“

(بانگِ درا: تہذیبِ حاضر)

”نسل“ قومیت، کلیا، سلطنت، تہذیب، رنگ
 کٹ مرا ناداں، خیالی دیوتاؤں کے لئے
 مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
 اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
 ”خواجھی“ نے خوب جن جن کے بنائے سکر ات
 شکر کی لذت میں ٹوٹا گیا نقدِ حیات
 انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
 مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
 (بانگِ درا: تہذیبِ حاضر)

ابھی تک آدنی صید زبون، شہر یاری ہے
 نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
 وہ حکمت ناز تھا جس پر فردِ مندانِ مغرب کو
 تدبیر کی فسوں کاری سے ٹکم ہو نہیں سکتا
 عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی، جہنم بھی
 قیامت ہے کہ اتناں نوریٰ انساں کا شکاری ہے!
 یہ عتالیٰ مگر جھوٹے ٹولوں کی ریڑھ کاری ہے!
 ہوس کے ہتھیارِ خونیں میں تیغِ کلوزاری ہے!
 جہاں میں جس تمدن کی پناہ سرمایہ داری ہے
 یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ توری ہے نہ توری ہے
 (بانگِ درا: الملوغِ اسلام)

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست
 رزا بجاہد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
 تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
 تزدید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں
 (بانگِ درا: نظرِ یقانہ)

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
 دفعِ مرض کے واسطے بل پیش کیجئے!

دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجئے!
کہتا ہے ماسٹر سے کہ ربل پیش کیجئے
(بانگِ درا: ظریفانہ)

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
بنائے خوب آزادی نے پھندے
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے
(بانگِ درا: ظریفانہ)

مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیانا الّا
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا داویلا
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی تھی خارا!
(بالِ جبریل: نادر شاہ غازی)

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری!
مری دانش ہے افراگی مرا ایماں ہے زتاری!
(بالِ جبریل: غزل 14)

اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش!
مسجد و کتب و مئے خانہ ہیں مدت سے خموش!
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش!
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش!
گا ہے گا ہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سر دوش!
(بالِ جبریل: غزل 56)

حرم کا راز توحیدِ ام ہے
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے!
(بالِ جبریل: رباعی)

میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!
(بالِ جبریل: فرمانِ خدا فرشتوں سے)

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
ایکشن، ممبری، کونسل، صدارت
میاں بھار بھی پھیلے گئے ساتھ

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے لآ سے
دبا رکھا ہے اس کو زخمہ در کی تیز دستی نے
فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
تُو اے مولائے یرب آپ میری چارہ سازی کر

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام
میں نے پایا ہے اسے اہلِ سحر گاہی میں!
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشہِ غرب

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
تہذیبِ نوی کارگہ شیشہ گراں ہے

ساتی کہاں اس فقیری میں میری
کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری!
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
بشری ہے آئینہ دار نذیری
کہ ہوں ایک جتیدی و اردشیری!
(بال جبریل: دین و سیاست)

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ!
زمین میر و سلطان سے بیزار ہے
تماشا دکھا کر مداری گیا!
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!
بٹانِ عجم کے پجاری تمام!
یہ امت روایات میں کھو گئی!
(بال جبریل: ساتی نامہ)

کہ روح اس مدئیت کی رہ سکی نہ عقیف!
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف!
(ضرب کلیم: مغربی تہذیب)

دل سینہ بے نور میں محروم تسلی!
یہ وادیٰ ایمین نہیں شایانِ تجلی!
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی!
(ضرب کلیم: یورپ اور یہود)

ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش!

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
خصوصت تھی سلطانی و راہبی میں
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادتی
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی

زمانے کے انداز بدلے گئے
ہوا اس طرح قاش راز فرنگ
پرانی سیاست گرمی خوار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
مسلمان ہے توحید میں گرم جوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام
حقیقت خرافات میں کھو گئی

لساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

پیش فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوکے سے
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر

ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش!

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش!
 ہر گرگ کو ہے تڑپ معصوم کی تلاش!
 اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ رومانے کر دیا سر بازار پاش پاش!
 پیر کلیسیا! یہ حقیقت ہے دل خراش!

(ضرب کلیم: ابی سینیا)

کہاں فرشتہ تہذیب کی ضرورت ہے جہاں قمار نہیں، زن تنگ لباس نہیں
 نہیں زمانہ حاضر کو اس میں دشواری جہاں حرام بتاتے ہیں شغل سے خواری
 (ضرب کلیم: انتداب)

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
 خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خیر و بصیر فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
 کنیز اہرن و دوں نہاد و مردہ ضمیر تو ہیں ہراول لشکر کلیسیا کے سفیر!
 (ضرب کلیم: لادین سیاست)

ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار! اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
 بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار! یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
 تدبیر سے کھلتا نہیں، یہ عقدہ دشوار! جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل
 بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار! ترکان "جفا پیشہ" کے پنجے سے نکل کر
 (ضرب کلیم: دام تہذیب)

میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
 سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو! کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
 (ارمغان حجاز: ایلین "اپنے مشیروں سے")

ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارا دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
 تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
 ایلین کو یورپ کی مشینوں کا سہارا اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا
 (ارمغان حجاز: بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)

اسلام: نشأۃ ثانیہ

نشأۃ کا مطلب ہے: اُگنا، ظاہر ہونا، پیدا ہونا۔

نشأۃ ثانیہ کا مطلب ہے: دوبارہ سے ظاہر ہونا، دوبارہ جی اٹھنا، دوبارہ عروج۔
اسلامی نشأۃ ثانیہ کا مطلب ہے: اسلام کا دوبارہ عروج۔ موجودہ زوال اور پستی سے نکل کر دوبارہ وہی عروج حاصل کرنا جو ظہور اسلام کے بعد ابتدائی چند صدیوں میں اسلام کو پوری دنیا میں حاصل تھا۔

تنظیم اسلامی کے بانی مبنی محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے ایک مضمون ”اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل“ میں لکھا ہے: ”قرآن حکیم سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے اور رسول کریم ﷺ کی احادیث میں تو صراحت کے ساتھ اس کی خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے قبل ایک بار پھر اللہ کا دین اللہ کی زمین پر اسی شان کے ساتھ غالب ہوگا، جس شان سے چودہ سو سال قبل ہوا تھا، اور اس بار دین اسلام کا غلبہ پورے کرۂ ارض کو محیط ہوگا اور پورا عالم انسانی توحید کے نور سے منور ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے اس نور کی جھلک دکھاتے ہوئے فرمایا تھا:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود پھر جسیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں جو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے! یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!
قرآن مجید میں تین بار یعنی سورۃ توبہ کی آیت 33، سورۃ الفتح کی آیت 28 اور

سورۃ الصاف کی آیت 9 میں یہ فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾
”وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم)

اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اُسے کُل دین یا تمام ادیان (مذہب) پر۔“
گویا نبی کریم ﷺ کی آمد و بعثت کا مقصد ”دین حق کا غلبہ“ ہے اور دوسری طرف مختلف
اسلوبوں سے تین ہی بار یہ فرمایا کہ آنحضور ﷺ کی بعثت تمام نوع انسانی کے لئے
ہے۔ جیسے سورہ سبأ کی آیت ۲۸ میں فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾

”ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر۔“

یوں دین اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی خلافت عالمی، آفاقی اور پورے عالم انسانی
اور کرۂ ارضی کو محیط ہے۔ اس کی صریح پیشین گوئیاں بھی صحیح احادیث میں موجود ہیں۔
چنانچہ مسند احمد بن حنبل میں حضرت مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ
نے فرمایا: ”روئے ارضی پر کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں بچے گا، خواہ وہ اینٹ گارے کا بنا
ہوا ہو یا کنبلوں کے خیمے کی صورت میں ہو، جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے،
چاہے کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ یا پھر کسی پست ہمت کے ضعف کے ذریعے
(یعنی یا تو گھر والا خود ایمان لے آئے گا یا اسے اسلام کی بالادستی قبول کرنی ہوگی!)۔“
اس پر حضرت مقداد فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: تب تو وہی بات پوری
ہو جائے گی کہ کُل دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے! (اشارہ ہے سورۃ الانفال کی
آیت 39 کی جانب)

محترم ڈاکٹر اسرار احمد قرآن و حدیث کے ان حوالوں کے ساتھ جب ”بر عظیم
پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل“ پر اظہار رائے کرتے ہیں تو نتیجہ
علامہ اقبال کے حق میں نکالتے ہیں: ”اب حالیہ تاریخ پر نظر ڈالئے تو صاف نظر آئے گا
کہ بیسویں صدی عیسوی ”احیائے اسلام“ کی جدوجہد کی صدی ہے۔ چنانچہ اس کے
آغاز کے ساتھ ہی وہ عمل بھی شروع ہو گیا تھا جسے اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے ”ہمہ جہتی
احیائی عمل“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جو اس صدی کے رُبعِ اول کے خاتمے کے بعد تو
پوری شدت اختیار کر گیا تھا..... تقریباً پون صدی پر پھیلی ہوئی اس تاریخ میں اہم ترین
اور جامع ترین شخصیت علامہ اقبال کی ہے۔ اُن کے بارے میں جس قدر غور کیا جائے

حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اُن کی یہ ”جامعیت“ حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بیک وقت قومی اور احمائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرم عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکرِ اسلامی کے مجدد ہیں (”الہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید“ اُن کے خطبات کا عنوان ہے) تو دوسری جانب تصورِ پاکستان کے خالق اور نظریہ پاکستان کے ”موجد“ بھی ہیں۔ اسی طرح وہ داعی الی القرآن بھی ہیں اور حکیم الامت بھی۔ جہاں تک قرآن کے فلسفہ و حکمت کے بحرِ عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور اُن کا کوئی دوسرا شریک یا مثیل ہے ہی نہیں۔“

”جس طرح ڈیڑھ دو صدی قبل شاہ ولی اللہ دہلوی کی دُور رس نگاہ نے بقول اقبال ”ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی“ کے لئے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب کیا تھا اور اُسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، صرف اُسی طرح نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر حضرت علامہ اقبال کی عقابِ نگاہ نے ایک جانب لندن میں جا بسنے والے محمد علی جناح کو ”قومی ناخدا“ کی حیثیت سے معین کیا اور خود انہیں اس پہلو سے ”خود شناسی“ کا جو ہر عطا کیا، اور دوسری جانب حیدرآباد دکن میں مُقیم ابوالاعلیٰ مودودی کو ”متکلم اسلام“ ہونے کا اہل سمجھا اور انہیں اس خطے میں منتقل ہونے کی دعوت دی جس کے بارے میں اُن کی چشمِ باطن اور نگاہِ دُور بین دیکھ چکی تھی کہ وہاں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام ”تقدیر الہی“ ہے۔“

آج جبکہ پندرہویں صدی ہجری کا سورج طلوع ہوئے 23 برس ہو چکے ہیں، ہمیں چاروں طرف تمام اسلامی ممالک میں ایک اضطراب اور زوال کی کیفیت دکھائی دے رہی ہے۔ کہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر ہے، کہیں مسلمانوں اور اسرائیل کے درمیان بیت المقدس کا مسئلہ ہے، کہیں چینیا کے مسلمان، کہیں یورپ کے قلب میں بوسنیا کے مسلمان اپنے دین کی سرفرازی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ 11 ستمبر 2001ء کو امریکا کے ”ٹریڈ سنٹر“ کے انہدام کے بعد تو صدر بٹش نے صاف ہی کہہ دیا: ”صلیبی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے“۔ یہ دوسری بات ہے کہ

اُس نے سیاسی مصلحتوں کے تحت مسلمانانِ عالم سے معذرت کا اظہار کیا۔ امریکا کے ایک بڑے عیسائی پادری نے حال ہی میں بیان دیا ہے کہ ”پیغمبرِ اسلام دہشت گرد تھے“ (نعوذ باللہ)۔ مسلمانانِ عالم کے زوال کی نشانی اس سے بڑی کیا ہو سکتی ہے کہ ایسے شرمناک بیانات پر اُن کی اجتماعی تنظیم ”اسلامی سربراہ کانفرنس“ (او آئی سی) ایک معمولی قرار داد بھی منظور نہ کر سکی۔ یہ کوئی علاقائی اور اقتصادی جنگ نہیں، بلکہ ایک نظریاتی اور مذہبی جنگ ہے۔ افغانستان میں روس کی جارحیت اور اب امریکا کی شدید جارحیت، عراق پر امریکی جارحیت اور اس کے بعد پورے عالمِ اسلام کے لئے مغرب کا جارحانہ چیلنج اور مسلمان ملکوں کی بے بسی اور بے چارگی علامہ اقبال ایسے مجتہد کو آواز دے رہی ہے۔

عصرِ حاضر میں ملتِ اسلامیہ کے درمیان اضطراب و اجتہاد کی تحریک کے محرک مفکرِ اسلام علامہ اقبال ہیں جن کی دُور رس نگاہ نے آنے والے دور یعنی عصرِ رواں کی عکاسی، ایک پیش گوئی کی صورت میں ”جوابِ شکوہ“ میں پہلے ہی سے کر دی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک روز عالمِ اسلام کا چمن خونِ شہداء کی لالی سے گلزار بن جائے گا اور جب بہار آئے گی تو گلستانِ اسلام ہر قسم کے خس و خاشاک سے خالی ہو جائے گا اور یہ پیش گوئی اُس وقت صحیح ثابت ہوگی جبکہ عالمِ اسلام کے آسمان کا رنگ عنابی ہوگا۔ اسلامی ممالک کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ علامہ نے اپنی نظم ”بلادِ اسلامیہ“ میں یوں پیش کیا ہے:

سرزمینِ دلی کی مسجدِ دلِ غم دیدہ ہے ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
 پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں! خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمین
 سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
 دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
 جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد
 ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی

یہ جنم وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامانِ نازِ لالہ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوش ارم جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم
جس کے غنچے تھے چمنِ سامان وہ گلشن ہے یہی!

کانپتا تھا جن سے روما ان کا مدفن ہے یہی!

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدہٴ مسلم کا نورِ ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگِ نمناک ہے

نقطہٴ قطنیہ ، یعنی قیصر کا دیارِ مہدی اُمت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمین بھی پاک ہے آستانِ مند آرائے شہِ لولاک ہے
نکتہٴ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلمان ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر!

سینکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر!

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خوابِ گاہِ مصطفیٰ! دید ہے کعبے کی تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے ماتدِ تکمیل اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام ایوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے جانشینِ قیصر کے، وارثِ مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام ہند ہی بنیاد ہے اس کی، نہ فارس ہے نہ شام
آہ! میثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو نقطہٴ جاذبِ تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں

صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

علامہ اقبال نے جون 1912ء میں ایک نظم ”مسلم“ کے عنوان سے تخلیق کی تھی

جس میں انہوں نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم نشیں! مسلم ہوں میں تو حید کا حال ہوں میں
 نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
 حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
 دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا
 میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
 قسمت عالم کا مسلم کو کپ تابندہ ہے
 آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
 کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
 یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
 ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
 یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکیر ہے
 سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو میں
 ”حضور رسالت مآب میں“ کے عنوان سے اپنی نظم میں اقبال سرور کائنات

حسنِ انسانیت ﷺ کی خدمت میں اپنی حاضری کو یوں بیان کرتے ہیں:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
 قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن نظامِ کہنہ عالم سے آشنا نہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجکو

حضور آیہِ رحمت میں لے گئے مجکو

کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز! کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز

اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا

ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
 جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
 طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں اقبال نذرانے کے طور پر ایک آگینہ پیش کرتے ہیں، جس میں ایک ایسی چیز ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی اور جس سے اُمتِ مسلمہ کی آبرو جھلکتی ہے، یعنی طرابلس کے شہیدوں کا لہو۔ طرابلس تو ایک علامت ہے، ورنہ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں اللہ کی راہ میں مسلمان شہادت گاہ اُلفت میں اپنا لہو بہاتے ہیں، وہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے (اقبال کی زبان ہی سے سہی) ”جواب شکوہ“ میں مسلمانوں کو بیدار ہونے کی تلقین کی ہے اور اقوامِ عالم میں مسلمانوں کو جو فضیلت حاصل ہے، اُس کی یاد دلائی ہے۔ ”جواب شکوہ“ ایک طویل نظم ہے، اُس کے چند آخری بند یہ ہیں، جن میں عصرِ حاضر کی آفتوں اور سختیوں کے باوجود دیگر اقوامِ عالم پر مسلمانوں کی برتری کا اظہار کیا گیا ہے۔

عہدِ نو برق ہے آتشِ زینِ ہر خرمن ہے ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
 اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے ملت ختمِ رسلِ شعلہ پہ پیرا ہن ہے
 آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
 آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی کو کبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چکنے والی
 خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
 رنگِ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
 یہ نکلتے ہوئے سورج کی افقِ تابانی ہے!

اتیں گلشنِ ہستی میں ثمرِ چیدہ بھی ہیں اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
 سینکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے بردمندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کفعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا غیریک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخلِ شمعِ استی و درِ شعلہ دودِ ریشہ تو

عاقبت سوزِ بود سایہ اندیشہ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے

عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ پیا یورشِ بلغاری کا غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دلِ آزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے

نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

پشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کو کپِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مگنِ قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا رختِ بردوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا نغمہٴ موج سے ہنگامہٴ طوفان ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپشِ آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامن کہسار میں میدان میں ہے بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر مراکش کے بیابان میں ہے اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شان رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں ہلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پھر اقبال تمام نوجوانانِ ملت کے عالمگیر ترانے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کاش اس
”ترانہ ملی“ کا منظوم ترجمہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں اور بالخصوص اسلامی ملکوں کی قومی
زبانوں میں ہو جائے!

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
تینوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذواں ہماری
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اے موجِ دجلہ! تُو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
آساں نہیں مٹانا، نام و نشاں ہمارا
ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
خنجرِ ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
تھہتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
سو بار کر چکا ہے تُو امتحاں ہمارا
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا

جب ملت اسلامیہ کا کارواں پھر سے جادہ پیا ہونے لگتا ہے تو دنیا کے تمام نوجوانان

اسلام ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے حضور مجسم ”دعا“ بن جاتے ہیں۔

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
 پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
 محرومِ تماشا کو پھر دیدہٴ بینا دے دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھا دے
 بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سونے حرم لے چل اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
 پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر اس محلِ خالی کو پھر شاہدِ لیلیا دے
 اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
 رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر خود داریِ ساحل دے آزادیِ دریا دے
 بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو سینوں میں اُجالا کر دل صورتِ مینا دے
 احساسِ عنایت کر آثارِ مصیبت کا امروز کی شورش میں اندیشہٴ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا

تاشیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

نوجوانوں کا قافلہٴ ہمت و جرأت جب قدم بڑھاتا ہے تو اقبال ”ضربِ کلیم“ میں ”تم

باذن اللہ“ کے زیرِ عنوان اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے تم باذن اللہ
 وہیں زمیں وہیں گردوں ہے تم باذن اللہ
 کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
 تری رگوں میں وہی خون ہے تم باذن اللہ
 غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
 فرنگیوں کا یہ افسوں ہے تم باذن اللہ

اسی طرح فرمایا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے پنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشائے دین نبوی ہے
باز و ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیں ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی
ہے ترک وطن سبتِ محبوب الہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(بانگِ درا: وطنیت)

کیا سنا تا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
لے گئے تھیلٹ کے فرزند میراثِ خلیل
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
لے رہا ہے نئے فروشانِ فرنگستان سے پارس
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ہو گیا مانند آبِ ارزاں مسلمان کا لہو
رہا وضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
گر سیاست چھوڑ کر داخلِ حصارِ دیں میں ہو
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
ہر کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائے گا
لسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
ظالمت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں، اسلامیوں کا سوز و ساز
نشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز!
وہ مئے سرکشِ حرارت جس کی ہے مینا گداز
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر!
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر!
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہ گزرا!
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر
(بانگِ درا: خضر راہ)

افتق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی!
 سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!
 تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
 شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
 ”نوارِ تلخِ تری زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی“
 خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
 یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!
 کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!
 جگرِ خون ہو تو چشمِ دل سے ہوتی ہے نظر پیدا!
 بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!
 مسلمان سے حدیثِ سوز و ساز زندگی کہہ دے
 (بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور!
 گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
 دوسرا نام اسی دین کا ہے ”فقرِ غیور“!
 (ضربِ کلیم: اسلام)

وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!
 آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
 جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
 جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
 ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
 (ضربِ کلیم: ہندی اسلام)

یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں
 یگانہ اور مثالِ زمانہ گونا گوں
 نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

دلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنگ تابی
 عروقِ مُردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
 مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفانِ مغرب نے
 عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
 اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
 سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
 کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
 اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
 جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں جینی
 ہزاروں سالِ نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
 ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی
 یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود
 لفظ ”اسلام“ سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
 وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
 اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
 مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید
 ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

بتاؤں تجھ کو مسلمان کی زندگی کیا ہے
 طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
 نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بے زاری

یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطون!
عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں!
(ضربِ کلیم: مدنیّتِ اسلام)

مجھ کو معلوم نہیں، کیا ہے نبوت کا مقام
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام!
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام
جس نبوت میں نہیں، قوت و شوکت کا پیام!
(ضربِ کلیم: نبوت)

پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم!
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟
(ضربِ کلیم: مکہ اور جنیوا)

فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
سیاہ روز مسلمان رہے گا پھر بھی غلام
(ضربِ کلیم: اشاعتِ اسلام فرنگستان میں)

کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے!
ممكن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے
(ضربِ کلیم: جمعیتِ اقوامِ مشرق)

ہو نہ جائے آشکارا، شرعِ پیغمبر کہیں
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
نے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیر رہ نشیں
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
عناصر اس کے ہیں، روح القدس کا ذوقِ جمال

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیر
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
عصرِ حاضر کی شبِ تاریں دیکھی میں نے
وہ نبوت ہے مسلمان کے لئے برگِ حشیش

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
تفریقِ ملل، حکمتِ افرنگ کا مقصود
کے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام

ضمیر اس مدنیّت کا دیں سے ہے خالی
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ، انگریز

پانی بھی مسخر ہے، ہوا بھی ہے مسخر
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ملہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
الحدر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحدر
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!

جشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین!
 ہے یہی بہتر الہیات میں الجھا رہے یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
 (ارمغان حجاز: ابلیس "اپنے شیروں سے")

دخترانِ ملت کے نام

دخترانِ ملت کے لئے اقبال وہی طرزِ حیات پسند کرتے ہیں جو قرونِ اولیٰ میں
 مسلمان خواتین میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت عورتیں مردجہ برقع کے نہ ہوتے ہوئے بھی
 شرم و حیا اور احساسِ عفت و عصمت میں مثالی نمونہ تھیں اور شرعی پردے کے اہتمام کے
 ساتھ ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔

اقبال کو ان شاعروں اور فن کاروں سے شکایت تھی جو عورت کے نام کا غلط
 استعمال کر کے ادب کی پاکیزگی، بلندی اور مقصدیت کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنی
 ایک نظم میں کہتے ہیں۔

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
 ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!
 اقبال دنیا کی سرگرمیوں کی اصل "ماؤں" کی ذات کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں
 کہ ان کی ذات امین ممکنات اور انقلاب انگیز مضمرات کی حامل ہے اور جو تو میں ماؤں
 کی قدر نہیں کرتیں ان کا نظام زندگی سنبھل نہیں سکتا۔

وہ آزادی نسواں کی تحریک کے اس لئے حامی نہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز
 میں عورتوں کی غلامی ہے۔ اس سے خواتین کی مشکلات آسان نہیں، مزید پیچیدہ ہو
 جائیں گی اور انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جذبہٴ امومت ختم ہو جائے گا
 ماں کی ماتا کی روایت کمزور پڑ جائے گی۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ جس علم سے عورت
 اپنی فطری خصوصیات کھودیتی ہے وہ علم نہیں بلکہ موت ہے اور مغربی تہذیب اقوامِ عالم
 کو اسی موت کی دعوت دے رہی ہے۔

علامہ اقبال حضرت فاطمہ زہراؑ کو ملتِ اسلامیہ کی خواتین کے لئے "مثالی

خاتون“ سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے اتباع کی تاکید کرتے ہیں کہ وہ کس طرح چکی پیتے ہوئے بھی قرآن مجید پڑھتی رہتی تھیں اور گھریلو کاموں میں مشکیزہ تک اٹھانے پر صبر فرماتی تھیں۔ اقبال کے خیال میں سیرت کی اسی پختگی سے حضرات حسنینؑ ان کی آغوش سے نکلے۔

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ
آں ادب پروردۂ صبر و رضا آسیا گرداں و لب قرآں سرا
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند چشم ہوش از اسوۂ زہراؑ مہند
تا حسینؑ شاخ تو بار آورد موسم پیشیں بہ گلزار آورد
اگر پندے ز درویشے پذیری ہزار امت بگیری تو نہ میری
بتولؑ باش و پنہاں شوازیں عصر کہ در آغوش شبیرؑے گیری

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
(بانگ درا: ظریفانہ)

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں
(ضرب کلیم: مرد فرنگ)

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش!
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ مرد بیکار و زن تہی آغوش!
(ضرب کلیم: ایک سوال)

بہت رنگ بدلے سپر بریں نے خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے وہ خلوت نشیں ہے! یہ خلوت نشیں ہے!
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے!
(ضرب کلیم: پردہ)

روشن ہے نگہ آئندہ دل ہے مکدر
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابترا!
وہ قطرہ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر!
(ضرب کلیم: خلوت)

اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُریکُنوں!
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!
(ضرب کلیم: عورت)

گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرمند
آزادئی نسواں کہ زمرہ کا گلو بند؟
(ضرب کلیم: آزادئی نسواں)

کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد
(ضرب کلیم: عورت کی حفاظت)

ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت!
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت!
(ضرب کلیم: عورت اور تعلیم)

غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود!
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود!
گرم اسی آگ سے ہے معرکہ بود و نبود!

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر لیکن

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشبہ خاک اس کی
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتب
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتہ شوق
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات

میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کی کشود!
(ضرب کلیم: عورت)

نوناہالانِ ملت کے نام

نئی نسل یا نژادِ نو سے اقبال کے گہرے تعلق کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے بچوں کے لئے کہی ہیں۔ یہ نظمیں گویا اس عظیم پیغام کی تمہید ہیں جو اقبال نئی نسل کو دینا چاہتے تھے اس لئے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لئے قریب قریب وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر اپنی خودی کو استوار و مستحکم کیا جاسکتا ہے۔

”ایک مکڑی اور مکھی“ کے عنوان کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد میں آنا گویا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔ ”پہاڑ اور گلہری“ میں یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ حقیقی بڑائی کا تعلق قد و قامت سے نہیں بلکہ حرکت و عمل سے ہے۔ ”ایک گائے اور بکری“ والی نظم میں اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا وجود ساری مخلوق کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ ”بچے کی دعا“ تعمیر سیرت کے سلسلے میں ایک لاثانی دعا ہے۔ چھوٹے بڑے عورت مرد بوڑھے جوان سب کو زبانی یاد ہے اور اس کا اثر سب کے دلوں پر نقش ہے۔ ”ہمدردی“ والی نظم صرف یہی نہیں کہ ہمدردی کا درس دیتی ہے بلکہ ظلمت کو روشنی اور بدی کو نیکی میں بدل دینے کا عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔

اقبال نے ان نظموں میں بڑا سادہ اور سلیس طرزِ مخاطب اختیار کیا ہے۔ بچوں کی نصیحت آموزی کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچپ کہانیوں کو آسان اور خوبصورت نظموں میں پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لئے اقبال کی یہ چند نظمیں بھی بہت مقبول ہوئی ہیں۔

ایک مکڑا اور مکھی

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

غیروں سے نہ ملے تو کوئی بات نہیں ہے
 آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
 مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی
 اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے

جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترتا
 مکڑے نے کہا: واہ! فریبی مجھے کبھی
 منظور تمہاری مجھے خاطر تھی وگرنہ
 اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے
 اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
 لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
 مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں پچھونے
 مکھی نے کہا: خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن

ان نرم پچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے

سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا!

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اس کی
 سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
 یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی!
 ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت
 آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
 یہ حسن یہ پوشاک یہ خوبی یہ صفائی!
 مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو سبھی
 انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
 یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی

آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
ذرا سی چیز ہے اس پر غرور! کیا کہنا!
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں!
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
کہا یہ سن کے گلہری تے منہ سنبھال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا!
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ کو
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
(بانگ درا)

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری
جب ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا
پہلے جھک کر اسے سلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں!

تھی سراپا بہار جس کی زمیں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
اور پھیل کے سایہ دار درخت
طائروں کی صدائیں آتی تھیں
چرتے چرتے کہیں سے آنکلی
پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

کٹ رہی ہے بری بھلی اپنی ہے مصیبت میں زندگی اپنی
 جان پر آ بنی ہے کیا کہئے! اپنی قسمت بری ہے کیا کہئے
 دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں رو رہی ہوں مُردوں کی جان کو میں
 زور چلتا نہیں غریبوں کا پیش آیا لکھا نصیبوں کا
 آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے اس سے پالا پڑئے خدا نہ کرے!
 دودھ کم دوں تو بڑھاتا ہے ہوں جو ڈبلی تو بیچ کھاتا ہے
 ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے! کن فریبوں سے رام کرتا ہے!
 اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
 بدلے نیکی کے یہ برائی ہے میرے اللہ! تری دہائی ہے!!
 سن کے بکری یہ ماجرا سارا بولی ایسا گلہ نہیں اچھا
 بات سچی ہے بے مزا لگتی میں کہوں گی مگر خدا لگتی
 یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ ہری گھاس اور یہ سایا
 ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں! یہ کہاں بے زباں غریب کہاں!
 یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
 اس کے دم سے ہے اپنی آبادی قید ہم کو بھلی کہ آزادی؟
 سو طرح کا بنوں میں ہے کھنکا واں کی گزران سے بچائے خدا!
 ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
 قدر آرام کی اگر سمجھو آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
 گائے سن کر یہ بات شرمائی آدمی کے گلے سے پچھتائی
 دل میں پرکھا بھلا برا اس نے اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
 یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
 دل کو لگتی ہے بات بکری کی!

(بانگ درا)

بچے کی دعا

(ماخوذ)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری! زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے! ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے!
 ہو مرے دم سے یونہی، میرے وطن کی زینت
 جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
 زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب! علم کا شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!
 ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا دردمندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا
 مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
 نیک جو راہ ہو، اس راہ پہ چلانا مجھ کو

(بانگِ درا)

ہمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبیل تھا کوئی اداس بیٹھا
 کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اڑنے چکنے میں دن گزارا
 پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
 سن کر بلبیل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
 حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
 کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
 اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا
 ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
 آتے ہیں جو کام دوسروں کے!

(بانگِ درا)

پیام بذریعہ جاوید اقبال

وہ بے شمار باتیں جو اقبال اپنے عہد کے نوجوان کے متعلق خود اس سے یاد دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں ان کی شاعری کے مختلف ادوار میں ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں بکھری اور پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان باتوں میں نہ باہم کوئی منطقی ربط ہے اور نہ تقدم و تاخر کا کوئی تعلق۔ اس کے باوجود کہ یہ سب خیالات داخلی طور پر ایک مضبوط منطقی اور فکری رشتے میں منسلک ہیں، وہ جب شعر کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ربط اور تعلق کے یہ رشتے قائم نہیں رہتے۔ ہر خیال خیالوں کی اس زنجیر سے الگ ہو کر جس میں فکر اور جذبے کی داخلی سطح پر وہ حلقہ بند ہے، ایک کڑی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور شعر میں اپنے واضح وجود کا الگ اعلان کرتا ہے۔ اقبال کے جن شعروں اور نظموں کا اب تک تجزیہ کیا گیا، ان میں بات تو کوئی بھی ایسی نہیں جو اقبال کے منظم فلسفہ حیات کا جزوء عنصر یا حصہ نہ ہو، لیکن یہ سب باتیں اس منظم فلسفے کے منفرد اور منتشر اجزا اور عناصر ہی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں تقدم و تاخر اور سبب اور نتیجے کا منطقی تعلق خود ہمارا ذہن پیدا کرتا ہے۔

لیکن اقبال کی چار نظمیں ایسی ہیں جن میں انہوں نے براہ راست اپنے فرزند جاوید کا نام لے کر اسے مخاطب کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں جاوید سے مراد جاوید اقبال نہیں، بلکہ جاوید کے پردے میں ہر مسلم نوجوان ہے۔ ان چاروں نظموں میں نوجوانانِ اسلام کے نام اقبال کا پیغام ایک منطقی ربط بھی رکھتا ہے اور راست گفتگو کا اندازِ مخاطب بھی۔ صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں جاوید کا نام اقبال کے فرزند کی حیثیت سے آیا ہے، نہ کہ عام نوجوانانِ اسلام کی حیثیت سے۔ یہ دو مقامات ”ارمغان حجاز“ (فارسی) کی دو رباعیوں میں ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

سحر جاوید را در سجدہ دیدم بہ صبحش چہرہ شام بیارائے
 (میں نے صبح کے وقت اپنے بیٹے جاوید کو سجدہ ریز دیکھا۔ اس کی صبح سے میری
 شام کے چہرے کو زینت دے۔ یعنی میں تو آخری عمر کو پہنچ گیا ہوں جبکہ جاوید کی
 زندگی کا آغاز ہے خدا کرے وہ میرے سرمایہ فکر و عمل کا وارث بن جائے۔)
 ایک اور رباعی میں اقبال رسول کریم ﷺ سے جاوید کے لئے دعا کرتے ہیں۔
 ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے
 ظاہر ہے کہ علامہ اقبال جس طرح اپنے پیارے فرزند کو عشق رسولؐ میں سرشار
 دیکھنا چاہتے تھے اسی طرح ہر مسلم نوجوان کو بھی آنحضور ﷺ کے رنگ و بو میں بسا ہوا
 دیکھنا چاہتے تھے۔

”جاوید کے نام“

پہلی نظم کا عنوان ”جاوید کے نام“ ہے جو ”بال جبریل“ میں شامل ہے۔ اس کے
 بارے میں جناب جاوید اقبال اپنی مشہور تصنیف ”مئے لالہ فام“ میں لکھتے ہیں:
 ”1931ء میں جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ابا جان انگلستان گئے تو
 اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انہیں ایک اوٹ
 پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لئے
 ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے لیکن میرا خط ان کی
 مندرجہ ذیل نظم کی شانِ نزول کا باعث ضرور بنا۔“

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر!
 خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!
 اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر!
 میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!
 مرا طریقِ امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!
 پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم بظاہر اقبال نے اپنے بیٹے جاوید ہی کے نام لکھی ہے
 لیکن بغور دیکھا جائے تو وہ اس میں ملتِ اسلامیہ کے تمام نوجوانوں سے مخاطب نظر
 آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

- (1) اے بیٹے! تیرے لئے لازم ہے کہ علم و عمل کے ذریعے معاشرے میں اپنی شناخت کرائے اور وہ مرتبہ حاصل کرے جو عزت و احترام کا حامل ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ قدیم روایات کو ترک کر کے خود کو نئی اور مثبت جہتوں سے ہم آہنگ کرے۔
- (2) خدا کرے تجھے وہ فطرت شناس دل عطا ہو کہ تو ان اشیاء کے رموز بھی جان سکے جو قوتِ گویائی سے محروم ہیں اور لالہ و گلاب جیسے پھولوں کی خامشی بھی تیرے لئے کلام بن جائے۔
- (3) اے فرزند! یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کو حرفِ آخر تصور نہ کر۔ تجھے عروج حاصل کرنا ہے تو اپنی ہی تہذیب اور اپنے ہی وطن کی مٹی اور اپنے ہی علوم و فنون سے وابستگی پیدا کر۔ مغربی تہذیب مصنوعی اور ناپائیدار ہے اور مشرق کے علم و فن اور تہذیب میں وطن کی مٹی کی خوشبو چچی ہوئی ہے۔
- (4) میری شاعری کو یوں سمجھو جیسے میں انگور کی نیل ہوں اور میری غزل اس کا ثمر ہے یعنی انگور۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ میرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر اور اس سے استفادہ کر۔ سادہ لفظوں میں یوں کہئے کہ میں نے اپنی شاعری میں جو اسرار و رموز بیان کئے ہیں ان کی معرفت حاصل کر کے پوری طرح ذہن نشین کر لے اور انہی پر کار بند ہو جا۔
- (5) میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ میرا طریقہ امیری نہیں، غربی ہے۔ بیٹے! خودی نہ بیچ، غربی میں نام پیدا کر۔

”جاوید کے نام“

نو جوانوں کے نام ایسا ہی ایک پیغام ”جاوید کے نام“ ہی سے دوسری نظم میں بھی دیا گیا ہے۔ یہ نظم بھی ”بالِ جبریل“ میں شامل ہے۔ ہر چند یہ نظم علامہ اقبال نے اپنے فرزند جاوید کے لئے تخلیق کی اور اس میں کچھ نصیحتیں بھی ہیں، مشورے بھی ہیں دعائیں بھی ہیں لیکن دیکھا جائے تو یہ نظم محض جاوید کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مخاطب پوری ملتِ اسلامیہ کے نو جوان ہیں۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ!

خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ!

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود
 ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!
 ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
 خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ!
 حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
 خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ!
 ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
 کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!

(1) اے فرزندِ عزیز! یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین کر لے کہ خودی ہی ایسا جذبہ ہے جس کو اپنانے سے فرد کو حیاتِ جاودانی نصیب ہو سکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ خودی ہی ہے جو افراد کو عمرِ جاوداں اور قوموں کے عروج کے لئے روشنی فراہم کرتی ہے۔

(2) انسان خواہ کتنی ہی غربت، مفلسی یا گنہگامی کی حالت میں زندگی بسر کرے، لیکن اگر وہ اس حقیقت کو مد نظر رکھے کہ میں ”صاحبِ مقصود“ ہوں یعنی مجھے اللہ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ میں اپنی خودی کی تربیت کر کے خلافتِ الہیہ کا مستحق بن جاؤں گا تو یہ تصور اسے فروغ (ترقی) بھی عطا کر سکتا ہے اور فراغ (سکونِ قلب) بھی۔ اصل مسئلہ ہا مقصد زندگی کا ہے۔

(3) اب ذرا ایک پرندے کوئے کی جانب دیکھو کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ادھر ادھر منہ مار کر بڑی چالاکی اور عیاری سے دوسروں کا مال تو ہڑپ کر جاتا ہے، لیکن خود اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعے کبھی اپنی روزی حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلند پروازی نہیں ہے۔ یہ بھی جان لو کہ اگر کسی بلند پرواز شاہین کا بچہ کالے کی صحبت میں رہے گا تو وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو کر کوئے کی سی مادہ میں ہی اختیار کر لے گا۔ لہذا بری صحبت سے گریز کرو کہ یہ انسان کے اپنے کردار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

(4) پورے معاشرے پر نظر ڈالو تو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسانوں میں غیرت و حیا کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ کسی بھی برائی کو قبول کرتے ہوئے ان کو کسی طرح کی پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سوائے بیٹے! اس صورت حال کے پیش نظر میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کر لیں کہ تجھ میں غیرت و حیا کا جذبہ برقرار رہے اور تیری جوانی داغ دار ہونے سے ہمیشہ بچی رہے۔

(5) جہاں تک میری زندگی اور کردار کا تعلق ہے، اس امر سے واضح ہو جائے گا کہ میں ایک خوش طبع، خوش مزاج، خوش اخلاق اور خوش وضع ہونے کے باعث ان خانقاہوں کے قریب تک نہ پھٹک سکا جو تنگ ظرف، خشک طبع اور فساد خیز ملاؤں کی کمین گاہوں میں بنی ہوئی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نو جوانوں کو جہاں رند مشرب لوگوں کی صحبت سے گریز کرنا چاہئے وہاں ایسی خانقاہوں سے بھی بچنا چاہئے کہ ہر دو مقامات کا ماحول غیرت و حیا سے عاری ہو چکا ہے، اور نو جوان نسل کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

”جاوید سے“

اس عنوان کے تحت یکے بعد دیگرے تین نظمیں ”ضربِ کلیم“ میں شامل ہیں۔ ان تین نظموں کا مخاطب بظاہر ”جاوید“ ہے، مگر درحقیقت مراد تمام مسلم نو جوان ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہوں۔ ان تینوں نظموں کا پورا متن، اور مطلب، ملاحظہ ہو:

(1)

غارت گردیں ہے یہ زبانہ ہے اس کی تہاد کا فراتہ
 دریاہ شہنشاہی سے خوشتر مردان خدا کا آستانہ!
 لیکن یہ دور ساحری ہے انداز ہیں سب کے جاؤ دانہ!
 سرچشمہ زندگی ہوا خشک باقی ہے کہاں مئے شہانہ!
 خالی ان سے ہوا دبستان تھی جن کی نگاہ تازیانہ!
 جس گھر کا مگر چراغ ہے، تو ہے اس کا مذاق عارفانہ!
 جو ہر میں ہولا! تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ!

شاخِ گل پر چمک، لیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ!
 وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ!
 دہقان اگر نہ ہو تن آساں ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ!
 غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
 وقتِ ہنر است و کارسازی ست

(1) پہلے شعر میں اقبال نے جو انسانِ اسلام سے کہہ رہے ہیں کہ عصرِ حاضر کی چمک دمک اور فریب میں نہ آجانا۔ بظاہر یہ بڑا ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کا دور نظر آتا ہے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہل مغرب کی سازشی فطرت اور غلط روش کی وجہ سے موجودہ دور دینِ اسلام کو برباد کرنے والا دور ہے اور اس کی سرشت و جبلت میں کفر اور لادینی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس لئے عصرِ حاضر کے برے اثرات سے بچنا ضروری ہے۔

(2) بادشاہوں کے درباروں اور ان کی سرکار میں حاضری سے یہ بہتر ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں (فقیروں اور درویشوں) کی چوکھٹ پر حاضری دی جائے۔

(3) یہ موجودہ دور جادوگری کا دور ہے اور اس کے سارے طور طریقے جادو جیسے ہیں۔ جس طرح جادوگر ہمارے خیالات اور نظروں کو باندھ کر نقل چیزوں کو اصل بنا کر پیش کرتا ہے اور ان چیزوں کو جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا، حقیقت کا رنگ دے کر ہمارے سامنے لاتا ہے، اسی طرح عہدِ حاضر بھی غلط چیزوں کو صحیح بنا کر پیش کر رہا ہے، اور اس کی سحری اور جادوگرانہ فریب دہی ہمیں نقل کو اصل سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے۔

(4) دورِ حاضر میں اہل مغرب کی جادوگری کے باعث ایسی ہوا چلی ہے یا ایسے اسباب پیدا ہوئے ہیں جن سے دریائے زندگی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں اور رات کی وہ شراب جو ہمارے آباء و اجداد اور ہمارے بزرگ ہمیں پلاتے تھے، یعنی شرابِ معرفت، اب باقی نہیں رہی ہے۔

(5) دورِ حاضر کے مدرسے ان استادوں اور بزرگوں سے خالی ہو چکے ہیں جن کی نگاہ

اپنے طالب علموں کو راہِ راست پر رکھنے کے لئے تازیانے کا کام دیتی تھی اور وہ اپنی نظر اور صحبت سے ان کی صحیح تربیت کرتے تھے۔

(6) اس شعر میں جاوید کو خاص طور پر خطاب کیا گیا ہے کہ تو جس گھر کا چراغ ہے اس خاندان کا ذوق اور مزاج ہمیشہ سے صوفیانہ اور عارفانہ رہا ہے۔ تمہیں بھی چاہئے کہ اس ذوقِ عارفانہ کو اپنے اندر پیدا کرو اور زندہ و قائم رکھو۔

(7) علامہ نے یہاں ایک اصولی اور بنیادی بات کہی ہے کہ اگر کوئی شخص کلمہ توحید پڑھ کر دل سے مسلمان بن چکا ہے اور اس کی سرشت میں اس کا اثر پختہ ہو چکا ہے تو پھر اہل مغرب کی تعلیم حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ وہ ایمان جو اس کی اصلیت میں ہوگا وہ اسے کھرے اور کھوٹے کی شناخت کرادے گا اور فرنگی تعلیم سے وہی چیز حاصل کرے گا جو بحیثیت مسلمان اس کے فائدے کی ہوگی اور باقی سب کچھ رد کر دے گا۔

(8) اس شعر میں ایک پرندے کی مثال دے کر راز کی بات بتائی ہے کہ جس طرح پرندہ پھولوں کی شاخ پر چہکتا ہے لیکن نظر اپنے گھونسلے پر رکھتا ہے اور ادھر ادھر گھوم کر پھر اپنے آشیانے میں آ جاتا ہے اسی طرح اے مسلم نوجوان تو بھی جہاں چاہے جا جو چاہے پڑھ، لیکن اپنی خود نگری اور خود شناسی کے گھر کو نہ بھول، اور اپنے دینی شعائر اور اپنی روایات کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

(9) آدمی کوئی معمولی اور سرسری چیز نہیں ہے، خاص طور پر مردِ مومن جو خدا کا نائب ہے۔ دیکھنے میں تو وہ پانی کے ایک قطرے کی مانند ہے، یعنی محض ایک فرد نظر آتا ہے، لیکن وہ ایسا قطرہ ہے کہ بے کنار سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ سوائے مسلم نوجوان! تو اپنی اس اصلیت کو مت بھول۔

(10) اس شعر میں علامہ نے مسلم نوجوان کو محنت کی قدر و قیمت اور فضیلت سے آگاہ کیا ہے اور ایک کسان کی مثال دے کر سمجھایا ہے کہ اگر کسان آرام طلب اور تن آسان نہ ہو اور رات دن خون پسینہ ایک کر کے محنت کرنے کا عادی ہو تو وہ اس ایک

دانے سے جو وہ زمین میں بوتا ہے، سو ہزار دانے لیتا ہے۔ اس لئے اے جوان! تو بھی محنت کر، تاکہ کامیابی اور خوشحالی تیرے ہاتھ آئے۔

(11) اے مسلم! جوان! اے میرے بیٹے! یہ کھیل کود اور تفریح کا وقت نہیں ہے، بلکہ کچھ سیکھنے کا وقت ہے۔ غافل ہو کر مت بیٹھ۔ کوئی نہ کوئی، ہنر سیکھ اور کوئی نہ کوئی کام کر کے دکھا۔

(2)

سینے میں اگر نہ ہو دل گرم رہ جاتی ہے زندگی میں خامی!
 نچیر اگر ہو زیرک و چست آتی نہیں کام کہنہ دامی!
 ہے آب حیات اسی جہاں میں شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی!
 غیرت ہے طریقتِ حقیقی غیرت سے ہے فقر کی غلامی
 اے جانِ پدز نہیں ہے ممکن شاہیں سے تدرو کی غلامی
 نایاب نہیں متاعِ گفتار صد انوری و ہزار جامی!
 ہے میری بساط کیا جہاں میں؟ بس ایک نغانِ زیربامی
 اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
 اللہ کی دین ہے جسے دے میراث نہیں بلند نامی
 اپنے نورِ نظر سے کیا خوب فرماتے ہیں حضرت نظامی
 جائے کہ بزرگ بایت بود
 فرزندئ من ندادت سود!

(1) اگر آدمی کے سینے میں عشق کی حرارت رکھنے والا دل نہ ہو تو سمجھئے کہ اس کی زندگی خام ہے یعنی اس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہے۔ اس لئے زندگی کو پختہ بنانے کے لئے عشق ضروری ہے۔

(2) اگر شکار (چاہے پرندہ ہو یا جانور) دانا اور چالاک ہو تو کہنہ مشق شکاری بھی اسے اپنے جال میں پھانسنے میں ناکام رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر میری قوم کے نوجوان دانا، ہوشیار اور بیدار ہوں تو کوئی ان کو اپنا سیاسی غلام نہیں بنا سکتا۔

(3) آب حیات کا چشمہ ضرور موجود ہے جس کا پانی پینے سے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ یہ چشمہ ڈھونڈنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی کو اس کی پیاس بھی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ کسی بھی منزل کے حصول کے لئے اس تک پہنچنے کی آرزو کا ہونا ضروری ہے۔

(4) درویش دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک غیرت والے اور خوددار دوسرے بے غیرت اور بے حیا۔ اقبال نے یہاں سچی درویشی اور فقر کا ذکر کیا ہے کہ اس میں غیرت خودداری اور حیا ہوتی ہے۔ صحیح فقر (درویشی) کی غلامی غیرت (خودداری) سے ہاتھ آتی ہے۔

(5) اے بیٹے! شاہین بن تیر نہ بن کیونکہ شاہین کبھی تیر کا غلام یا شکار نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ تیر ہی شاہین کا شکار بنتا ہے۔ مقصود اس نصیحت سے یہ ہے کہ شاہین جیسی خوددار اور آزادانہ زندگی گزارو تیر جیسی بے ہمت اور غلام زندگی نہ گزارو۔

(6) متاع گفتار یعنی شاعری کوئی ایسی دولت نہیں ہے جو کہیں نہ ملے۔ اس دنیا میں انوری اور جامی جیسے سینکڑوں شاعر موجود ہیں۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کی شاعری افراد یا قوم کو بیدار کرتی ہے اور کس کی شاعری انہیں سلا دیتی ہے۔ اس لئے اگر شاعری کا ذوق ہو تو ایسا شعر کہہ کہ جس سے سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھے۔

(7) پچھلے شعر میں علامہ نے شاعر اور شاعری کی بات کی ہے۔ علامہ چونکہ خود بھی شاعر ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بطور شاعر میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میری شاعری تو اس آہ و فغاں کی طرح ہے جو کوئی شخص چھت، کے نیچے کھڑے ہو کر کرے۔ مراد یہ ہے کہ میں تو غلام قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ اگر آزاد قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو میری آہ و فغاں اس شخص کی طرح ہوتی جو چھت، کے اوپر کھڑے ہو کر اسے بلند کرتا۔ وہ فریاد سنی بھی جاتی۔ میری فریاد کون سنتا ہے۔

(8) اس شعر میں بھی علامہ نے شاعری ہی کی بات کو آگے بڑھایا ہے اور کہا ہے کہ میری شاعری سچی شاعری ہے۔ میں اپنے کلام میں ادبی کچھ کہتا ہوں جو ایک سچے شاعر کو کہنا چاہئے، اس لئے میں لوگوں کی نظروں میں بلند نام عزت دار اور قدر و منزلت والا

سمجھا جاتا ہوں۔

(9) نام کی شہرت اور بلند نامی کوئی خاندانی وراثت نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اللہ جسے چاہے عطا کر دے۔ اس کے لئے اعلیٰ کردار و عمل ضروری ہے۔ یہ بھی اللہ ہی کی توفیق ہے۔

(10) اور (11): ان دو شعروں میں علامہ نے براہ راست اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو، مشہور فارسی شاعر نظام گنجوی نے اپنے بیٹے سے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس جگہ تجھے بزرگی و احترام کا مرتبہ حاصل ہونا چاہئے وہاں تجھے میرا بیٹا ہونا کوئی فائدہ نہ دے گا، بلکہ تمہارے ذاتی جوہر اور اوصاف کام آئیں گے کیونکہ بزرگی و عزت اپنے کردار و عمل سے ملتی ہے وراثت سے نہیں۔

(3)

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز دین و دولت تمار بازی!
 ناپید ہے بندۂ عمل مست باقی ہے فقط نفس درازی!
 ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
 اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی!
 کنجشک و حمام کے لئے موت ہے اس کا مقام شاہ بازی!
 روشن اس سے خرد کی آنکھیں بے سرمۂ یوعلیٰ و رازی!
 حاصل اس کا شکوہ محمود فطرت میں اگر نہ ہو ایازی!
 تیری دنیا کا یہ سرائیل رکھتا نہیں ذوق نے نوازی!
 ہے اس کی نگاہ عالم آشوب در پردہ تمام کار سازی!
 یہ فقر غیور جس نے پایا بے تیغ و سناں ہے مرد غازی!
 مومن کی اسی میں ہے امیری
 اللہ سے مانگ یہ فقیری

(1) مسلمانوں کے لئے اس دور کے شب و روز بڑے کٹھن اور مشکل ہیں کیونکہ موجودہ زمانہ مغربی تہذیب و تمدن کی وجہ سے اتنا خراب ہو چکا ہے کہ دین اور حکومت

دونوں جواری بن گئے ہیں۔ دونوں اپنے اغراض و مفادات کے لئے عوام کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

(2) اس زمانے میں صاحبِ کردار اور عمل مست لوگ ناپید ہو گئے ہیں البتہ سانسوں کو طول دینے والے یعنی بیکار زندگی گزارنے والے لوگ عام ہیں۔

(3) اگر تجھ میں درویشی کی خواہش ہو اور اس کے حصول کی ہمت ہو تو ایسا فقر (درویشی) تلاش کر جس کی جڑ حجاز میں ہو یعنی وہ فقر جو اسلامی فقر ہے وہ فقر جس پر رسول کریم ﷺ کو بھی فخر تھا اور جسے آپ نے ”الفقر فخری“ کہا تھا۔ اس کے سوا جو درویشی ہے وہ غیر اسلامی بھی ہے اور محض ڈھونگ بھی۔

(4) اے بیٹے! میں جس اسلامی اور حجازی فقر کی بات کر رہا ہوں اس فقر سے آدمی کے اندر اللہ کی شان بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ فقر کسی نفس یا کسی شے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ فقر جس میں احتیاج ہو یا خود محتاج ہو وہ حجازی نہیں ہے۔

(5) اے بیٹے! میں جس فقر کی بات کر رہا ہوں وہ شاہبازوں جیسے بڑے مرتبے والے فقر کی بات ہے۔ شاہباز فضاؤں میں آزادانہ اڑتا ہے۔ پہاڑوں پر اپنا ڈیرا بناتا ہے۔ اپنا شکار خود کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ فقر جس سے نبی کریم ﷺ نے بھی پناہ مانگی ہے وہ محتاجی کا فقر ہے جس میں فقیر چڑیوں (کنجشک) اور کبوتروں (حمام) کی طرح دانہ دنکا کا محتاج ہوتا ہے اور دوسروں کے بھروسے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی نہیں موت ہے۔

(6) اس شعر میں بھی اسلامی فقر کی بات کی گئی ہے کہ ایک عقل وہ ہے جو اپنی آنکھوں میں بوعلی سینا اور فخر الدین رازی کے فلسفے کا سُر مہ ڈالے روشن تو ہوتی ہے لیکن یہ عقل طالب کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی اور حقیقت کا مشاہدہ نہیں کراتی۔ دوسری عقل وہ ہے جسے فقر کا سُر مہ روشن کرتا ہے۔ یہ منزل مقصود پر بھی پہنچاتی ہے اور حقیقت کا مشاہدہ بھی کراتی ہے۔ اس لئے اے بیٹے! فقر والی عقل کی تمنا کر۔

(7) اسلامی فقر محمود غزنوی کا سادہ بہ اور شکوہ لئے ہوئے ہوتا ہے شرط یہ ہے کہ اس

کی سرشت میں ایازی (غلامی) نہ ہو۔ محمود غزنوی اپنے ایک غلام ایاز کو بہت چاہتا تھا اور اس کی ہر خواہش اور مرضی کو فوقیت دیتا تھا جس کے نتیجے میں اس کے ذاتی شکوہ اور دبدبے میں فرق آتا تھا۔ فقر بھی اگر کسی کا محتاج ہو اور اپنی شان بے نیازی اور شکوہ برقرار نہ رکھ سکے تو وہ بھی درست نہیں۔ اسلامی فقر کا جلال اور دبدبہ اس میں ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ دوسرے اس کے محتاج ہوں۔

(8) دور جدید جس نے اپنی مادی ترقی کے باوجود شرفِ انسانیت کو برباد کر کے رکھ دیا ہے اپنے اندر ایسی صلاحیت و طاقت نہیں رکھتا کہ مُردہ دلوں کو زندہ کر دے۔ جس طرح قیامت کے روز اسرافیل صُور پھونکے گا تو سب مُردے قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے، دور جدید کی بانسری میں اس قسم کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں فقر کی بانسری بجانے کا اگر ذوق نصیب ہو تو وہ اسرافیل کی طرح آدمی کے مُردہ دل کو زندہ کر سکتی ہے اور زمانہ جدید کے آدمی کو حیوان سے انسان اور مُردہ دل سے زندہ دل بنا سکتی ہے۔

(9) مرد فقیر کی نگاہ اسرافیل کی طرح مُردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ دنیائے دل میں تلاطم پیدا کر کے اس کو صحیح دل بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسی نگاہ جو دنیا میں انقلاب پیدا کر دے لوگوں کی تقدیریں بدل دے وہ پوشیدہ طور پر کارساز (دوسروں کے کام بنانے والی) ہوتی ہے۔ آج کے پیشہ ور فقیر خود گداگر ہیں۔ وہ اپنی محتاجی دور نہیں کر سکتے، دوسروں کے بگڑے ہوئے کام کیسے بنائیں گے۔ یہ کام اصل فقر اور اسلامی فقیر کا ہے کہ وہ لوگوں کی کارسازی کرتا ہے۔

(10) جس شخص کو خودداری اور غیرت والا فقر حاصل ہو جاتا ہے اسے میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تلوار اور نیزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ان آلاتِ حرب کے بغیر ہی فریقِ مقابل کے سامنے آ جاتا ہے اور اپنی نگاہ سے تلوار اور نیزے کا کام لیتا ہے۔ مرد فقیر کی نگاہ تقدیریں بدل دیتی ہے۔ وہ تلوار کا نہیں، نگاہ کی ضرب لگانے والا مرد میدان ہوتا ہے اور ہمیشہ فتح یاب ہو کر غازی بنتا ہے۔

(11) جو اہل ایمان واقعی مردِ مومن ہوتا ہے اس کی امیری دولت کی امیری نہیں ہوتی

بلکہ دولت فقر کی امیری ہوتی ہے۔ دھن دولت تو چھاؤں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے۔ فقر کی دولت وہ دولت ہے جس کو نہ زوال ہے اور نہ کوئی اسے چھین سکتا ہے۔ اے بیٹے! اللہ سے دعا کر کہ وہ تمہیں فقر کی یہ دولت عطا کر دے۔ دنیا کی دولت تو آنی جانی شے ہے اس پر فقر کی دولت کو قربان نہ کر دینا۔

”خطاب بہ جاوید“

(سخن بہ نژادِ نو)

اقبال کی ایک نظم ایسی ہے جس میں انہوں نے نوجوان نسل (نژادِ نو) کے متعلق اپنے خیالات اور پیغام کو ایک واضح ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے اور یوں یہ نظم نوجوانوں کے متعلق اقبال کے جملہ تصورات کا ایسا مرقع بن گئی ہے جس میں فکر اور شعر دونوں کے رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں جو آپس میں مل جل کر مرقع کو ایسی صورت دیتے ہیں کہ ان سے قلب و نظر دونوں کو زندگی ملتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے ”خطاب بہ جاوید“ جبکہ ذیلی عنوان ہے ”سخن بہ نژادِ نو“۔ گویا اقبال کو خود بھی خیال تھا کہ کہیں ”خطاب بہ جاوید“ کا مطلب جاوید بیٹے سے خطاب نہ لیا جائے اس لئے انہوں نے دوسرے عنوان سے وضاحت کر دی کہ یہ گفتگو دراصل نئی نسل سے ہو رہی ہے۔

یہ نظم ”جاوید نامہ“ کے آخر میں درج ہے جس کے مطالب اسلم جے راج پوری صاحب کی تجویز کے مطابق پورے عالم اسلام کے نصاب تعلیم کا جز بننے کے لائق ہیں۔ اس فارسی نظم کے مطالعے سے قاری جن گونا گوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے ان کا ظہور صرف اس وقت ہوتا ہے جب فلسفہ و شعر کی سطح ایک ہو جائے اور دونوں اپنا سفر پوری طرح ہم آہنگ ہو کر طے کریں۔ اس نظم کا پورا فارسی متن ترجمے اور کسی قدر تشریح کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ نوجوانانِ پاکستان یہ نظم حفظ کر لیں گے۔

پہلا بند

ایں سخن آراستن بے حاصل است بر نیاید آنچه در قعر دل است!
گر چه من حمد نکتہ کفتم بے حجاب نکتہ دارم کہ ناید در کتاب!

گر گویم می شود پیچیدہ تر! حرف و صوت او را کند پوشیدہ تر!

سوز او را از نگاہ من بگیر

یا ز آہ صبح گاہ من بگیر!

(1) یہ جو میں نے گفتگو کی انجمن سجائی ہے، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ جو کچھ میرے قلب کی گہرائی میں ہے، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مراد یہ ہے کہ دل کی بات زبان ادا نہیں کر سکتی۔

(2) اگرچہ میں نے اپنی شاعری میں سینکڑوں رمز کی باتیں کھول کر بیان کی ہیں، لیکن میں ایک ایسا نکتہ (رمز) رکھتا ہوں جو تحریر میں نہیں آسکتا۔

(3) اگر میں یہ نکتہ بیان کرتا ہوں تو ایسا کرنے سے یہ مزید الجھ جائے گا۔ میرے الفاظ اور میری آواز اس نکتے کو پہلے سے بھی زیادہ پوشیدہ کر دے گی۔

(4) اس نکتے کا سوز میری نگاہ سے یا پھر میری آہ سحر گاہی سے حاصل کر۔ مراد یہ ہے کہ اس نکتے نے میری نگاہ میں جو سوز اور میری آہ سحر گاہی میں جو درد پیدا کیا ہے، اگر تو اس کو میرے دل کی باریک بات کا نشان سمجھے تو شاید اس سے اصل بات کی طرف رجوع کر سکے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکے گا جب تو خود صاحب سوز ہوگا۔

اقبال نے ساری زندگی اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کی جو فکری رہنمائی کی ہے، ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس ایک نکتے کی طرف اقبال اپنے نوجوانوں کی توجہ مبذول کر رہے ہیں، اس کے متعلق اقبال کا خیال ہے کہ وہ اگر "حرف و صوت" کی مدد سے بیان کیا جائے تو اس کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے الجھ جائے گا۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اس نکتے کا راز اگر تمہیں کہیں ملے گا تو میری نگاہ میں یا میری آہ سحر گاہی میں۔

دوسرا بند

مادرت درسِ نختیں باتو داد غنچہ تو از نسیم او کشادا
از نسیم او ترا این رنگ و بوست اے متاع ما بہائے تو از دست

دولتِ جاوید ازو اندوختی از لب او لاله آموختی
 اے پسر! ذوقِ ننگہ از من بگیر سوختن در لاله از من بگیر!
 لاله گوئی؟ بگو از روئے جاں تاز اندام تو آید بوئے جاں!
 مہر و مہ گردد زسوزِ لاله دیدہ ام این سوز را در کوہ و کہ!
 این دو حرف لاله گفتار نیست لاله جز تیغ بے زہار نیست!
 زیستن با سوزِ او قہاری است

لالہ ضرب است و ضربِ کاری است!

(1) بیٹے! پہلا سبق تجھے تیری ماں نے دیا اور تیرا غچہ اُس کی نسیم سے کھلا۔ مراد یہ ہے کہ تیری پہلی تربیت گاہ ماں کی گود تھی جس نے لوریاں دے دے کر تیرے کانوں میں ”لالہ“ کا رس گھولا۔

(2) یہ تیرے اندر جو رنگ و بو ہے یہ سب ماں کی نسیم سے ہے۔ اے میری متاعِ عزیز! تیری قیمت ماں کی تربیت سے ہے کہ اسی کی تربیت نے وہ کچھ بنایا ہے جو ثواب ہے۔
 (3) تو نے ایمان اور اسلام کی ہمیشہ رہنے والی دولت اسی سے حاصل کی ہے۔ تو نے یہ ”لالہ“ ماں کے ہونٹوں ہی سے سن کر سیکھا ہے۔

(4) اس کا جو کام تھا وہ اس نے کر دیا۔ اے بیٹے! اب نگاہ کا ذوق مجھ سے حاصل کر۔ لالہ (کلمہ توحید) تو تو نے ماں سے سیکھ لیا ہے اب لالہ کی آگ میں جلنا مجھ سے سیکھ۔ مراد یہ ہے کہ لالہ کو قال (محض گفتگو) سے گزار کر حال (قلبی کیفیت) بنانے کا مجھ سے سیکھ۔

(5) اگر تو لالہ کہتا ہے تو پوری روحانی قوت سے کہہ تاکہ تیرے جسم سے روح کی خوشبو آئے۔ زبان سے کلمہ توحید ضرور پڑھ مگر دل سے اس کا اقرار بھی کر۔ کلمہ توحید کی روح کو اپنے اندر بسا کر اس کے مطابق زندگی بسر کر۔ تیرا ہر رنگ اور تیرا ہر بال توحید کی گواہی دے یہ ہے کلمہ توحید کے پڑھنے اور اس کے اقرار کا مقصد۔

(6) چاند اور سورج لالہ کے سوز سے گردش کرتے ہیں۔ میں نے اس سوز کو پہاڑ اور تنکے میں یعنی کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں دیکھا ہے۔ یہ ہے وہ نکتہ توحید جس

کے گرد ہر چیز دائرے کی طرح گھومتی ہے۔

(7) یہ دو حرف ”لا الہ“ (کوئی نہیں معبود سوائے اللہ کے) محض گفتگو نہیں ہیں۔ بیٹے یاد رکھئے ”لا الہ“ بے زہار تلوار کے سوا کچھ نہیں۔ (بے زہار تلوار کو شمشیر جو ہر دار بھی کہتے ہیں۔ یہ ایسی تلوار ہوتی ہے جس سے کسی کو پناہ نہ مل سکے جس کے وار کو روکا نہ جاسکے۔)

(8) اس ”لا الہ“ کے سوز میں جانا قہاری ہے۔ لا الہ ایک ضرب ہے اور کاری ضرب ہے یعنی زبان سے ”لا الہ“ کہہ کر یہ سمجھ لینا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں درست نہیں ہے۔ آدمی مسلمان اس وقت ہوتا ہے جب وہ توحید کا دل سے اقرار کرنے کے بعد پہلے خود پر اسے نافذ کرتا ہے اور پھر دوسروں پر اس کا رنگ جماتا ہے۔

اس بند میں یہ بتانے کے بعد کہ ”لا الہ“ کی دولت تُو نے اپنی مشفق ماں کی آغوش میں رہ کر حاصل کی اقبال کہتے ہیں کہ ”لا الہ“ کی آگ میں جلنے کا سبق تُو مجھ سے سیکھ لیکن یہ سبق تیری سمجھ میں اس وقت آئے گا جب تُو ذوق نگاہ کی دولت بیدار مجھ سے حاصل کرے۔ اقبال بڑے لطیف ایمانی انداز میں یہ بتاتے ہیں کہ ”لا الہ“ کے سوز سے سورج اور چاند گردش کرتے ہیں اور کوہ و ماہ میں اسی کے سوز کا عکس نظر آتا ہے۔ اے بیٹے! لا الہ کے ان دو لفظوں کو محض گفتار مت سمجھ۔ ان میں شمشیر جو ہر دار کی قوت ہے۔ ”لا الہ“ نہ صرف ضرب ہے بلکہ ضربِ کاری ہے۔

تیسرا بند

مومن و پیش کساں بستن نطق!	مومن و غداری و فقر و نفاق!
پاہیزے دین و ملت را فروخت	ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت!
لا الہ اندر نمازش بود و نیست	نازہا اندر نیازش بود و نیست!
نور در صوم و صلوت او نماند	جلوہ در کائنات او نماند!
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ	قتہ او حُب مال و ترس مرگ!
رفت از د آں مستی و ذوق و سرور	دین او اندر کتاب و او بگور!
سہش با عصر حاضر در گرفت	حرف دین را از دو پیغمبر گرفت

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد!
 تاجہاد و حج نماںد از واجبات رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوت
 روح چوں رفت از صلوت و از صیام فرد نامہوار و ملت بے نظام!
 سینہ ہا از گرمی قرآن تہی از چینس مرداں چہ امید بہی!
 از خودی مردِ مسلمان در گذشت
 اے خضر دستے کہ آب از سرگذشت!

(1) مومن ہو کر غلامی کا کپڑا کمر پر باندھنا اور مومن ہو کر غداری، مفلسی اور نفاق کی زندگی بسر کرنا، یہ متضاد باتیں ہیں۔

(2) اب اسی مومن نے ایک کوڑی کے عوض دین اور قوم کو فروخت کر دیا۔ اس نے گھر اور گھر کا اثاثہ جلا دیا۔

(3) کبھی اس کی نمازوں میں لا الہ (توحید کا رنگ) تھا، اب نہیں ہے۔ اس کے نیاز میں کبھی ناز تھا، اب نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور جس نیاز سے وہ سر بسجود ہوتا تھا، اس میں ایک مومنانہ شان تھی جو اب نہیں ہے۔

(4) اس کے روزوں اور اس کی نمازوں میں نور نہیں رہا۔ اس کی کائنات میں جلوہ حق نہیں رہا۔ یعنی آج اس کی نمازیں اور روزے بے تجلی ہیں۔

(5) وہ جس کی زندگی کا ساز و سامان اللہ تھا، اس کا فتنہ حُب مال اور اس کا خوف موت ہے۔ اب وہ مال کی محبت میں گرفتار ہے اور اللہ کی راہ میں جان دینے سے ڈرتا ہے۔ کبھی وہ اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کی ملکیت سمجھتا تھا، اس لئے ان کو بے دریغ اس کی راہ میں خرچ کر دیتا تھا۔ لیکن اب اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے ان کو خرچ نہیں کرتا۔

(6) اب اس سے ذوق و سرور کی مستی چلی گئی ہے۔ اس کا دین کتاب میں اور وہ خود قبر میں ہے، یعنی اس نے قرآن پر عمل چھوڑ دیا ہے اور مردوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔

(7) اس نے عصر حاضر کی صحبت اختیار کر لی ہے اور اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو چھوڑ کر زمانہ حال کے دو پیغمبروں کا دین قبول کر لیا ہے۔

(8) ان دو پیغمبروں میں سے ایک ایران کا تھا اور دوسرا ہندی نسل کا تھا۔ ایرانی حج سے بیگانہ تھا اور ہندی جہاد سے بے گانہ تھا۔ (ایران کے جھوٹے نبی کا نام مرزا حسین علی بہاء اللہ تھا۔ یہ 1817ء میں ایران کے مقام نور میں پیدا ہوا۔ اس نے صرف حج ہی نہیں بلکہ پوری شریعت محمدیؐ کو منسوخ کر دیا۔ اس کے پیروکار بہائی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے جھوٹے نبی کا نام مرزا غلام احمد تھا جو 1838ء میں قادیان میں پیدا ہوا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کرتے وقت جہاد کی نفی کر دی۔)

(9) جب حج اور جہاد مسلمانوں کے لئے واجب نہ رہے تو پھر نماز اور روزے سے بھی جان نکل گئی، یعنی وہ بھی بے اثر ہو گئے۔

(10) جب نماز اور روزے سے روح نکل گئی تو فرد بے لگام اور ملت بے نظام ہو گئی۔

(11) مسلمانوں کے سینے قرآن کی حرارت سے خالی ہو گئے تو ایسے مردوں سے اچھائی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

(12) مرد مسلمان نے خودی کو چھوڑ دیا۔ اے خضر! مدد کر کہ پانی سر سے گزر گیا ہے۔

اس بند میں جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے، موجودہ دور کے مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ مسلمان کی نمازیں ”لا الہ“ کے سوز سے خالی ہیں اور اس کے نیاز میں ناز مفقود ہے۔ اس کے صوم و صلوٰۃ میں نور کا اور اس کی کائنات میں جلوے کا ظہور نہیں۔ وہ مسلمان کہ جس کے لئے صرف اللہ کا نام سرمایہ حیات تھا، اب حُب دولت اور خوف مرگ کے دام میں اسیر ہے۔ عصر حاضر کی صحبت اور دو جھوٹے نبیوں کی جھوٹی تربیت نے اسے دین سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے حج اور جہاد کی حیثیت واجبات دین کی نہ رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے صوم و صلوٰۃ کے پیکر بے روح ہو کر رہ گئے اور جب روزے نماز سے روح رخصت ہوئی تو فرد کی زندگی میں ہمواری اور ملت کی زندگی میں انلم و ضبط باقی نہ رہا۔

پہلے تھا بند

سجدہ کز دے زمیں لرزیدہ است بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است

سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود در هوا آشفته گردد ہم چو دود!
 ایں زماں جز سر بزیری ہیچ نیست اندرو جز ضعفِ پیری ہیچ نیست!
 آں شکوہِ ربی الاعلیٰ کجاست ایں گناہِ اوست یا تقصیرِ ماست؟
 ہر کسے بر جادۂ خود تند رو ناقہٴ ما بے زمام و ہرزہ دو!
 صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب
 العجب! ثم العجب! ثم العجب!

(1) وہ سجدہ کہ جس سے زمین لرز اٹھتی تھی، جس کی مراد پر سورج اور چاند گردش کرتے تھے۔
 (2) اس سجدے کا نشان اگر پتھر خود پر ثبت کر لیتا تھا تو وہ پتھر دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔

(3) وہ سجدہ موجودہ زمانے میں سوائے سر جھکانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں سوائے بڑھاپے کی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی نماز محض مجبوراً اور بڑی مصیبت سمجھ کر ادا کرتے ہیں اس میں کوئی ذوق و شوق نہیں ہوتا۔

(4) وہ ربی الاعلیٰ کا دبدبہ کہاں ہے؟ یہ اس کا گناہ ہے یا ہماری تقصیر ہے؟ جب مسلمان سجدے میں ”ربی الاعلیٰ“ کہتا ہے تو وہ یہ الفاظ زبان سے ضرور ادا کرتا ہے، لیکن ”اعلیٰ“ رب کے سوا کسی غیر رب کو سمجھتا ہے۔

(5) ہر کوئی اپنے راستے پر سرپٹ دوڑا جا رہا ہے۔ ہماری اونٹنی بغیر نکیل کے ہے اور بے مقصد دوڑی جا رہی ہے۔ یعنی آج مسلمان اللہ کی راہ چھوڑ کر اپنے بنائے ہوئے راستوں پر جن کی کوئی منزل نہیں ہے دوڑے جا رہے ہیں۔

(6) کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان قرآن رکھتا ہے، لیکن طلب کا ذوق نہیں رکھتا۔ عجب ہے! اس بند میں اقبال عہدِ حاضر کے مسلمانوں کے سجدے کی بے کیفی کا ذکر کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ”ربی الاعلیٰ“ کا شکوہ آخر کہاں گیا اور صاحبِ قرآن ہوتے ہوئے مسلمان ذوق و شوق سے خالی کیوں رہ گیا!

یا نچواں بند

گر خدا سازد ترا صاحبِ نظر روزگارے را کہ می آید نگر!

عقل ہا بے باک و دل ہا بے گداز چشم ہا بے شرم و غرق اندر مجاز!
 علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل زوج اندر طواف آب و گل!
 آیا آں مرز و بوم آفتاب غیر میں، از خویشمن اندر حجاب!
 قلب او بے واردات تو بنو حاصلش را کس نکیرد با دو جو!
 روزگارش اندریں دیرینہ دیر ساکن و نخ بستہ و بے ذوق سیر!
 صید ملایان و نخچیر ملوک آہوئے اندیشہ او لنگ و لوک!
 عقل و دین و دانش و ناموس و تنگ بستہ فتراک لردان فرنگ!
 تا ختم بر عالم افکار او بردریدم پردہ اسرار او!

درمیان سینہ دل خوں کردہ ام

تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

(1) اگر خدا تجھے صاحب نظر بنائے تو جو زمانہ آنے والا ہے، اسے غور سے دیکھنا۔

(2) یہ آنے والا زمانہ ایسا ہوگا کہ جس میں لوگوں کی عقلیں بے باک اور دل بے گداز ہوں گے، آنکھیں بے شرم و حیا ہوں گی اور مجاز (ہوس) میں غرق ہوں گی۔

(3) علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل سب کے سب گروہ درگروہ آب و گل کے طواف میں لگے ہوئے ہیں، یعنی ان سب میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ روح سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ سب تن کے دلدادہ ہیں۔

(4) ایشیا جو آفتاب کی جنم بھومی ہے، یہاں کے رہنے والے خود سے تو حجاب میں ہیں اور غیروں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی علوم و فنون بھی مشرق سے نکلتے تھے۔ آج مشرق جہالت کی تاریکی میں ہے، اپنے علوم و فنون سے ناواقف اور یورپ کے علوم و فنون کا شیدائی۔

(5) ایشیا کا قلب نئی نئی واردات سے خالی ہے۔ اس کے فکر و خیال کو کوئی جو کے دودانوں کے عوض بھی خریدنے کے لئے تیار نہیں۔

(6) اس پرانی، گھسی پٹی دنیا میں اس کی زندگی ساکن، نخ بستہ، جامد اور سیر و حرکت کے ذوق کے بغیر ہے۔

(7) وہ جاہل اور غلط کارمندان اور بادشاہوں (نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں) کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ تو ایسا ہرن ہے جس کا فکر لنگڑا اور گھٹنوں کے بل ہاتھ ٹیک کر چلنے والا ہے۔

(8) اس کی عقل، دین، دانش، ناموس، ونگ، فرنگیوں کے لارڈوں کی فتراک میں (شکار کی طرح) بندھے ہوئے ہیں، یعنی یہ سب کچھ فرنگیوں کے تابع ہیں۔

(9) میں نے مشرق کے افکار پر چڑھائی کی اور اس کے پردوں کو چاک کر دیا، یعنی میں نے اہل مشرق کی کمزوری کا راز کھول کر بیان کر دیا ہے۔

(10) اہل مشرق کی حالت زار دیکھ کر میں نے اپنے سینے میں دل خون کر لیا ہے، تب جا کر میں نے ان کی دنیا بدلی ہے۔

اس بند میں اقبال ایک بار پھر نوجوان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تجھے صاحب نظر کرے تو اس دنیا کی ایک جھلک دیکھ جو اس وقت تیرے سامنے ہے۔ ان دنیا والوں کی عقلیں بے باک ہیں، ان کے دل گداز سے خالی ہیں، ان کی آنکھوں میں شرم باقی نہیں رہی اور وہ سرتاپا ”مجاز“ میں غرق ہیں۔ اس عہد میں علم و فن، دین و سیاست اور عقل و دل سب آب و گل کے طواف میں مصروف ہیں۔

چمٹا بند

من بطبع عصر خود گفتم دو حرف کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف!

حرف ایچاچ و حرف نیش دار تا کنم عقل و دل مرداں شکار!

حرف تہ دارے باندا فرنگ نالہ مستانہ از تار چنگ!

اصلی این از ذکر واصل آں ز فکر اے تو بادا وارثہ این فکر و ذکر!

آجویم از دو بحر اصل من است فصل من فصل ست و ہم وصل من است!

تا مزاج عصر من دیگر قتاد

طبع من ہنگامہ دیگر نہاد!

(1) میں نے اپنے زمانے کی طبیعت کے بارے میں دو باتیں کی ہیں۔ یوں سمجھو کہ یہ

دو باتیں نہیں ہیں بلکہ دو سمندرروں کو دو برتنوں میں بند کر دیا ہے۔

(2) یہ باتیں بیچ دار اور چمکتی ہوئی ہیں، تاکہ میں مردوں کی عقل اور دل کو شکار کروں۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے کلام میں دو قسم کی باتیں کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا تعلق عقل اور ذہن سے ہے اور دوسری وہ ہیں جن کا تعلق دل اور عشق سے ہے۔ ایک قسم میری باتوں کی فکر کے تحت آتی ہے اور دوسری قسم ذکر کے تحت۔ (مثلاً میں نے اپنی کتب ”فلسفہ عجم“ اور ”تشکیل جدید الہیات“ میں جو باتیں کی ہیں وہ عقل و ادراک اور فلسفہ و حکمت و دانش کا پہلو رکھتی ہیں جبکہ جو باتیں میں نے اپنے اردو اور فارسی منظوم کلام میں کی ہیں ان پر عشق و مستی غالب ہے وہاں عقل و حکمت بھی دل کے تابع ہے۔) اے بیٹے! تو دونوں سے استفادہ کر۔ میں مانتا ہوں کہ میری ساری کتابوں کا انداز بیچ دار و نیش دار ہے لیکن میری اور میرے مخاطبین کی ضرورت ہی یہ تھی کہ میں یہ انداز بیان اختیار کروں۔ بات عشق کی ہو یا عقل کی عام شاعروں کی طرح سادہ انداز میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے مشکل انداز بیان مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔

(3) میں نے فرنگیوں کی طرح فلسفہ و حکمت کی تہ دار باتیں کی ہیں اور اپنے رُباب کے تاروں سے مستانہ نالے بھی پیدا کئے ہیں، یعنی مومنانہ اور عاشقانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق میں نے عشق و عقل کے دونوں اسلوب اختیار کئے ہیں۔

(4) عشق کی اصل ذکر ہے اور عقل کی اصل فکر ہے۔ اے کاش، تو ان دونوں کا وارث و امین بن جائے۔

(5) میں ایک ندی ہوں۔ میری اصل (عشق و عقل کے) دو سمندروں سے ہے۔ میری جدائی میری جدائی بھی ہے اور میرا اصل بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں نے عشق اور عقل کو ان کے جداگانہ اور منفرد اوصاف کے ساتھ بھی بیان کر دیا ہے اور ان کے باہمی تعلق کی بناء پر بھی۔

(6) چونکہ میرے زمانے کا مزاج اور طرح کا ہے اس لئے میری طبع نے بھی ایک اور طرح کا ہنگامہ کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہلے ادوار کے شاعروں نے ان ادوار کے

تقاضوں کے مطابق شاعری کی ہے اور میں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ اس وقت ضرورت تھی کہ عقل کی بے راہ روی دکھا کر عشق کی راہ مستقیم دکھائی جاتی، اور محض اس عقل کو اختیار کرنے کے لئے کہا جاتا جو عشق کے تابع ہے۔ جہاں فکر کی بات کی جاتی، وہاں ذکر کی اہمیت بھی بتائی جاتی اس لئے کہ ذکر بغیر فکر اور فکر بغیر ذکر کے بیکار ہے۔

یہ بندان تصورات کی تمہید ہے جو اگلے بند میں اقبال پیش کرنے والے ہیں۔ یہ ساتواں بند ایک لحاظ سے پوری نظم کا قلب اور روح ہے۔ اس بند میں اقبال نے عہد حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور علم کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

ساتواں بند

نوجوانان تشنہ لب، خالی ایغ شتہ زو، تاریک جاں، روشن دماغ!
کم نگاہ و بے یقین و ناامید چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید!
ناکساں منکر زخود مومن بغیر خشت بند از خاک شاں معمار دیر!
کتب از مقصود خویش آگاہ نیست تا بجزب اندر روش راہ نیست!
نور فطرت را زجان ہا پاک شت یک گل رعنا ز شاخ او نرسد!
خشت را معمار ما کج می نہد خونے بط با بچہ شاہیں دہد!
علم تا سوزے نگیرد از حیات دل نگیرد لذتے از واردات!
علم جز شرح مقامات تو نیست علم جز تفسیر آیات تو نیست!
سوختن می باید اندر نارِ حس تا بدانی فقرہ خود را زمس!
علم حق اول حواس، آخر حضور
آخر او می گنجید در شعور!

(1) عصر حاضر کے نوجوان تشنہ لب ہیں اور ان کے پیالے خالی ہیں، یعنی ان کو نہ ذکر کا خیال ہے نہ فکر کی اہمیت کا اندازہ۔ اس لئے ان کے چہرے چمک دار، جانیں تاریک اور دماغ روشن ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ جسم کی آرائش و تزئین کے تو قائل ہیں، روح کی تجلی کے قائل نہیں۔

(2) وہ کم نگاہ بے یقین اور نا اُمید بھی ہیں۔ اُن کی آنکھوں نے جہان میں کوئی چیز نہیں دیکھی، یعنی وہ دنیا کی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔ اور ہوتے بھی کیسے ان کے پاس وہ نگاہ ہی نہیں ہے۔ اُن کو حقیقتِ کائنات کا یقین ہی نہیں ہے۔ وہ زندگی کے مقاصد سے بے خبر ہونے کی بنا پر مایوسانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(3) یہ نوجوان ناکس ہیں، کسی شمار میں نہیں کیونکہ وہ اپنی ہستی کا انکار کرتے ہیں اور دوسروں کی ہستی پر ایمان لاتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی روایات اور اقدار کو ہیچ سمجھتے ہیں اور دوسروں کی روایات اور اقدار کو عزیز جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بُت خانے کا معمار ان کی مٹی سے اینٹیں بناتا ہے اور اپنے بُت خانے میں لگاتا ہے۔

(4) آج کا وہ مکتب، جس میں یہ نوجوان تعلیم پاتے ہیں، اپنے مقصود سے آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں آدمی کے اندر جذب ہونے کی راہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کا مدرسہ اور آج کا استاد ذہن اور بدن کی عمارتیں تو تعمیر کرتا ہے، لیکن روح اور دل کی عمارتیں مسمار کرتا ہے۔ ان مدرسوں کا علم تن کی پرورش کے لئے ہے، من کی پرورش کے لئے نہیں اور مولانا روم کے الفاظ میں جو علم تن کے لئے پڑھا جاتا ہے، وہ آدمی کو سانپ بن کر ڈس لیتا ہے اور جو علم دل کے لئے پڑھا جاتا ہے وہ آدمی کا یار بن جاتا ہے۔

(5) ہمارے ان مدرسوں اور استادوں نے نوجوانوں کی جانوں سے فطرت کے نور کو دھو ڈالا۔ مدرسے کی شاخ سے ایک شاداب پھول بھی نہیں کھلا، یعنی مردِ حق ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔

(6) ہمارا معمار یعنی مدرسے کا استاد پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھتا ہے۔ وہ شاہین بچوں کو بوط کی عادت ڈالتا ہے۔

(7) علم جب تک زندگی سے سوز نہیں لیتا، اس وقت تک دل واردات کی لذت سے آشنا نہیں ہوتا، یعنی بے عشق علم دل کی موت ہے۔

(8) علم سوائے تیرے (یعنی آدمی کے) مقامات کی شرح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ علم سوائے تیری آیات کی تفسیر کے اور کچھ نہیں۔ یہ علم جو عصر حاضر نے تجھے دیا ہے یہ

آدمی کو اُس کے مقامات سے نا آشنا کرتا ہے۔ اُسے اُس کے مقصدِ تخلیق سے دور لے جاتا ہے اس لئے یہ علم اور حقیقتِ جہالت ہے۔ علم تو وہ ہوتا ہے جو تجھے تیری معرفت عطا کرے۔ محض رزق اور تن پروری کے لئے علم حاصل کرنا تو خود کو حیوان بنانا ہے۔ کھانا پینا اور ختم ہو جانا تو حیوانوں کی زندگی ہوتی ہے۔ بیٹے! علم وہ حاصل کر جو تجھے تجھ سے آشنا کرے تیری مخفی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور تجھے انسان بنائے بلکہ اس سے بھی آگے کے مقامات سے آشنا کرے۔

(9) حس کی آگ میں جلنا چاہئے تاکہ تو اپنی چاندی کو تانبے سے الگ پہچان سکے۔ آدمی کو پہلے وہ علوم حاصل کرنے چاہئیں جو ظاہری حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتے ہیں یعنی علم الاسما کے تحت آفاق کے علم سے آشنا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد وہ علوم حاصل کرنے چاہئیں جو باطنی حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ تب جا کر کھرے کھوٹے اور انسان حیوان کی شناخت ہوگی۔

(10) حق کا علم پہلے حواس سے حاصل کیا جاتا ہے اور آخر میں مشاہدات سے۔ یہ علم جو آخر میں آتا ہے حضورِ پیدا کرتا ہے۔ حضورِ ایسی چیز ہے جو عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ مراد یہ ہے کہ علمِ حق کی ابتدا بے شک شعور سے ہوتی ہے لیکن اس کی انتہا کا شعور کسی کے علم میں نہیں۔ اسے صرف کوئی مردِ حق ہی جان سکتا ہے۔

اس بند کے پہلے دو شعروں میں اقبال نے عہدِ حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ تشنہ لب، خالی ایام، شستہ رُو، تاریک جان، روشن دماغ، کم نگاہ، بے یقین اور نا اُمید۔ ان خامیوں کا ذمہ دار تعلیم کو ٹھہراتے ہوئے اپنی بات تمثیل اور کنایے کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کل کی تعلیم اپنے مقصود سے آگاہ نہیں اور اس کی لے نے طالب علم کے جذبِ اندروں تک رسائی حاصل نہیں کی۔ اس کی شاخوں میں گل رعنا اگانے کی صلاحیت نہیں اور اس نے شاہین بچوں میں بطخوں کی عادت پیدا کر دی ہے۔ علم جب تک زندگی سے سوز حاصل نہ کرے دل کو واردات (قلبی) میں کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی۔ آج کا علم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ

تیرے مقام و مرتبے کی تشریح اور تیری آیات ذات کی تفسیر کرے۔ انسان کو پہلے احساس کی آگ میں جلنا ہوتا ہے پھر وہ اس قابل بنتا ہے کہ اپنی ذات کے کھوٹے کھرے میں امتیاز کر سکے۔

علم حق اول حواس آخر حضور
آخر او می نگینہ در شعور!

آشواں بند

صد کتاب آموزی از اہل ہنر خوشتر آن در سے کہ گیری از نظر
ہر کے زان سے کہ ریزد از نظر مست میگردد باندازی دگر!
از دم بادِ سحر میرد چراغ لالہ زان بادِ سحر سے در ایام!
کم خور و کم خواب و کم گفتار باش گردِ خود گردندہ چون پیکار باش!
منکر حق نزدِ مٹا کافر است منکرِ خود نزدِ من کافر تر است!
آن پانکار وجود آمد " عجول ایں عجول و ہم ظلوم و ہم جہول!
شیوۂ اخلاص را محکم بگیر پاک شو از خوفِ سلطان و امیر!
عدل در قہر و رضا از کف مدہ قصد در فقر و غنا از کف مدہ
عزم دشوار است؟ تادیلے مجو جز بقلب خویش قدیلے مجو
حفظ جان اہا ذکر و فکر بے حساب حفظ تن یا ضبط نفس اندر شایب
حاکمی در عالم بالا و پست جز محفظِ جان و تن ناید بدست
لذتِ سیر است مقصودِ سفر گر نگہ بر آشیان داری پیر
ماہ گردد تا شود صاحب مقام سیرِ آدم را مقام آمدِ حرام!
زندگی جز لذت پرواز نیست آشیان بافطرت او ساز نیست!
رزق زراغ و کرس اندر خاکِ گور

رزقِ بازاں در سواہ ماہ و نور

(۱) اگر تو اہل ہنر سے سو کتابیں بھی پڑھے تو اس سے دو ایک درس بہتر ہے جو تو کسی مردِ کامل سے حاصل کرے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اولیا کی صحبت کا ایک لمحہ صد سالہ

بے ریا طاعت سے بہتر ہوتا ہے۔

(2) ہر شخص اُس شراب سے جو نظر سے ٹپکتی ہے اپنے اپنے انداز میں مست ہوتا ہے یعنی ہر شخص اپنی طلب اور ظرف کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتا ہے۔

(3) پچھلے شعر کے مفہوم کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ صبح کی ہوا کے جھونکے سے چراغ بجھ جاتا ہے۔ اسی جھونکے سے لالے کے پھول کے پیالے میں شراب آ جاتی ہے یعنی وہ سرخ و شاداب ہو جاتا ہے۔ چراغ کو موت اور لالے کو زندگی نصیب ہوتی ہے حالانکہ جھونکا ایک ہی ہے۔

(4) اے بیٹے! کم کھاؤ، کم بولو اور کم سوؤ اور اپنے گرد پُرکار کی طرح گھومو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات کا طواف کر۔ غیروں کا دست نگر نہ ہو۔ اپنی معرفت حاصل کرنے میں کوشاں رہ۔ کھانے، سونے اور باتیں کرنے ہی کو زندگی نہ بنالے۔ ان تین چیزوں سے بے تعلقی تجھے تیری خودی کی معرفت اور اس کے استحکام میں مددگار ثابت ہوگی۔

(5) اللہ کا منکر مُلا کے نزدیک کافر ہے، لیکن میرے نزدیک اپنی ذات کا منکر بڑا کافر ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو پوشیدہ ہے لیکن تو خود تو ظاہر ہے۔ ظاہر کا انکار کرنا اور غیب کی جستجو کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ پہلے خود کو تلاش کر۔ جب تو اپنی تلاش کر لے گا تو اللہ بھی مل جائے گا۔ مُلا اللہ کو اپنے سے باہر ڈھونڈتا ہے جبکہ اللہ اس کے اندر ہے۔ اس کی شہ رگ سے قریب ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ جس نے خود کو تلاش کر لیا، گویا اُس نے اپنے رب کو پا لیا۔ علامہ اقبال نے اسی لئے بار بار کہا ہے کہ خدا کی تلاش کرتے رہو۔ اپنے قریب جاؤ۔ یہ بات حضرت علیؓ کے اس مشہور مقولے پر مبنی ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

(6) منکر حق اللہ کے وجود کے انکار کی وجہ سے عجول (جلد باز) ہے کہ اُس نے بلا سوچے سمجھے اور تحقیق و تفتیش کے بغیر محض جلد بازی سے اُس کے وجود سے انکار کر دیا۔ منکر عجول کے علاوہ ظلوم اور جہول بھی ہے۔ ظلوم اس لئے کہ اس نے اپنا انکار کر کے خود پر ظلم کیا اور اپنی مخفی صلاحیتوں سے بے خبر رہ کر خود سے جاہل رہا۔

(7) اخلاص کا شیوہ سختی سے اختیار کرنا اور اس طرح سلطان اور امیر کے خوف سے آزاد ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا دامن خلوص سے تھام لے۔ اس طرح تو غیر اللہ سے بے نیاز ہو جائے گا۔

(8) تُو طیش میں ہو یا خوشنودی کی حالت میں، دونوں حالتوں میں عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ مفلسی ہو یا امیری، میانہ روی کو نہ چھوڑ۔

(9) اگر اللہ کا کوئی حکم دشوار ہے تو اُس کی تاویل نہ ڈھونڈ۔ کسی مشکل کشا سے اُس کا حل ڈھونڈ۔ اپنے معنی پیدا نہ کر۔ اپنے قلب کے سوا کہیں اور سے چراغ نہ ڈھونڈ۔

(10) روح کی حفاظت اللہ کے بے حد و حساب ذکر کرنے میں ہے اور جسم کی حفاظت جوانی میں ضبطِ نفس سے ہے۔

(11) عالم بالا و پست (دنیا اور آخرت) میں سرفرازی ہاتھ نہیں آتی، سوائے جان و تن کی حفاظت کے۔

(12) سفر کا مقصد سیر کی لذت ہے۔ اگر تو اپنے آشیاں ہی رکھے ہوئے ہے تو پھر نہ اڑ۔ مقصد یہ ہے کہ ترقی کے حصول کے لئے بہت سی آسائشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تو روحانی ترقی چاہتا تو تجھے دنیا کے علائق سے الگ ہونا پڑے گا۔ یاد رکھ، اس سفر میں جو لذت تجھے نصیب ہوگی، وہ دنیا کی لذتوں سے بڑھ کر ہوگی۔ پرواز کی لذت آشیانے کے سکون کی لذت سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے۔ سکون چھوڑ، حرکت اختیار کر۔ تن کا آرام چھوڑ اور روح کی بالیدگی کے اسباب پیدا کر۔

(13) چاند اس لئے گردش کرتا ہے کہ وہ صاحبِ مقام ہو جائے، یعنی چودھویں کی رات تک مکمل ہو جائے۔ اس کے بعد اُس کا سفر ارتقا ختم ہو جاتا ہے، لیکن آدمی کے لئے مقام کرنا حرام ہے۔ وہ تو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اس کے ارتقا کی کوئی حد نہیں۔

(14) زندگی، پرواز کی لذت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آشیانہ اس کی فطرت کو اس نہیں آتا۔

(15) کوئے اور گدھ کا رزق قبر کی مٹی میں ہے۔ وہ مُردہ لاشوں کا گوشت کھاتے

ہیں۔ بازوں (شاہینوں) کا رزق چاند اور سورج کے نواح میں ہے۔ وہ بلند پرواز کرتے ہوئے فضا میں زندوں کا شکار کرتے ہیں۔

یہ بند بچھلے بند کے افکار و خیالات کا نکلہ ہے۔ اس کا ایک ایک شعر مفہوم اور مزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ ضرب المثل بن کر زبان و قلب کا وظیفہ بنے۔ چوتھا شعر ”کم کھاؤ، کم سوؤ، کم بولو“ علامہ اقبال کو ایک خاص موقع پر یاد آیا۔ وہ 6 نومبر 1931ء کو لندن میں ”اقبال لٹریٹری ایسوسی ایشن“ کی ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ”1905ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مغربی ادبیات اپنی ظاہری دل فریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لئے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہئے۔“ آگے چل کر اقبال کہتے ہیں: ”اگرچہ میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ہے، تاہم رفقا کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنا تعداد کو بڑھائیے۔ میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند کو کی ہے، یعنی۔“

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش

گرد خود گردندہ چوں پد کار باش

”کم کھاؤ، کم سوؤ، کم بولو“ دراصل خواجہ نظام الدین اولیا کا قول ہے اور یہ مصرع ہو بہو اس قول کا فارسی ترجمہ ہے۔

چھٹے شعر کے دونوں مصرعوں میں قرآنی آیات کے حوالے ہیں۔ پہلا مصرع سورہ بنی اسرائیل کی آیت 11 کی طرف اشارہ ہے:

﴿وَيَذُوعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾

”انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے۔ انسان بڑا ہی جلد با

ز واقع ہوا ہے۔“

دوسرا مصرع سورہ احزاب کی آیت 72 کی طرف اشارہ ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ
يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾

”ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ
اُسے اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے
اٹھالیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔“

نواں بند

سزِ دیں صدقِ مقالِ اکلِ حلالِ خلوت و جلوتِ تماشائے جمال!
در رہِ دیں سختِ چوں الماسِ زیِ دلِ بحقِ بر بند و بے دسواسِ زی!
سزے از اسرارِ دیں بر گویمتِ داستانی از مظفرِ گویمت
اندرِ اخلاصِ عملِ فردِ فریدِ پادشاهے با مقامِ بایزید
پیش او ابے چو فرزنداں عزیزِ سخت کش چوں صاحبِ خود در ستیز
سبزہ رنگے از نجیبانِ عربِ با وفا بے عیب پاکِ اندرِ نب
مردِ مومن را عزیزِ اے نکتہ رسِ چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟
بن چہ گویم وصفِ آں خیر الجیادِ کوہ و روئے آ بہا رفتے چو باد
روزِ بیجا از نظرِ آمادہ ترِ تند بادے طائفِ کوہ و کمر!
در تگِ او فتنہ ہائے رستخیزِ سنگ از ضربِ سم او ریز ریز
روزے آں حیواں چو انساں ارجمندِ گشت از دردِ شکم زار و نژند
کرد بیطارے علاجش از شرابِ اسپ شہ را وا رہاند از بیچ و تاب
شاہِ حق میں دیگر آں یکراں نخواستِ شرعِ تقویٰ از طریقِ ماجد است
اے ترا بخشد خدا قلب و جگر
طاعتِ مردِ مسلمانے نگر!

(1) دین کا راز سچ بولنے اور حلال کھانے میں ہے۔ خلوت ہو یا جلوت، دونوں جگہ
جمالِ خداوندی کا تماشا کرنے میں ہے۔ ظاہر ہے، جب خدا کا جلوہ ہر جگہ نظر آئے گا تو
کج فکری اور کج عملی اختیار ہی نہیں کی جاسکتی۔ کوئی دیکھ رہا ہو تو چوری کون کرتا ہے۔

(2) دین کی راہ میں الماس کی طرح سختی کے ساتھ جی۔ حق کے ساتھ دل لگا اور شک و دوسواں کے بغیر زندہ رہ۔ مراد یہ ہے کہ دین کی راہ پر اس طرح ثابت قدمی سے چل کہ کوئی چیز بھی تیری راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے اور تیرے پاؤں کو لغزش نہ دلا سکے۔

(3) بیٹے! میں تجھے اسرارِ دین میں سے ایک سبز (بھید) بتاتا ہوں۔ اس کی وضاحت کے لئے میں تمہیں مظفر بادشاہ کی ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔ (سلطان مظفر پندرہویں صدی عیسوی میں گجرات، مشرقی ہند کے علاقے کا ایک طاقتور بہادر اور دین دار بادشاہ تھا۔)

(4) وہ عمل کے اخلاص میں ایک مثل شخص تھا۔ وہ بازید بسطامی جیسے مردِ فقیر کا سامرتبہ رکھنے والا شخص تھا۔

(5) اس کے پاس ایک گھوڑا تھا جو اُسے بیٹوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ جنگ کے موقع پر اپنے مالک کی طرح سخت کوشش تھا۔

(6) وہ گھوڑا نسل کا سبزہ رنگ اور عرب کے اصیل گھوڑوں میں سے تھا۔ وہ باوقا، بے عیب اور نسب میں پاک تھا۔

(7) اے نکتہ رس بیٹے! مردِ مومن کے لئے قرآن، تلوار اور گھوڑے سے بڑھ کر اور کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے۔

(8) میں اُس شریف و اصیل اور بہترین گھوڑے کے اوصاف کے متعلق کیا کہوں۔ وہ پہاڑوں اور دریاؤں سے ہوا کی طرح گزر جاتا تھا۔

(9) وہ جنگ کے دن نظر سے بھی زیادہ تیز تھا۔ تیز ہوا کی طرح پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کر لیتا تھا۔

(10) اس کی دوڑ میں قیامت کے فتنے تھے۔ اُس کے سُم کی ضرب سے پھر ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے۔

(11) ایک روز وہ گھوڑا جو انسان کی طرح ارجمند تھا، پیٹ کے درد کی وجہ سے کمزور اور نڈھال ہو گیا۔

(12) جانوروں کے معالج نے اُس کا علاج شراب سے کیا، اور اس طرح اُس نے بادشاہ کے عزیز گھوڑے کو درد کے پیچ و تاب سے نجات دلائی۔

(13) خدا شناس بادشاہ نے پھر کبھی اس گھوڑے کو سواری کے لئے طلب نہ کیا۔ بے شک تقویٰ کا راستہ ہمارے راستے سے جدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ گھوڑے نے شراب پی لی تھی، اس لئے بادشاہ نے اس پر سوار ہونے کو بھی حق پرستی کے خلاف سمجھا۔

(14) اے بیٹے! خدا تجھے قلب و نظر عطا کرے۔ ایک مسلمان کی اطاعت کا یہ رنگ دیکھ، کہ اس نے اُس گھوڑے پر بھی سوار ہونا گوارا نہ کیا جس نے شراب پی لی تھی۔

دسواں بند

دیں سراپا سوختن اندر طلب انتہا لیش عشق و آغازش ادب!
 آبروئے گل ز رنگ و بوئے ادست بے ادب بے رنگ و بوئے آبرو ست!
 نوجوانے را چو بینم بے ادب روز من تاریک می گردد چو شب!
 تاب و تب در سینہ افزاید مرا یاد عہد مصطفیٰ آید مرا!
 از زمان خود پشیمان می شوم در قرون رفتہ پنہاں می شوم!
 ستر زن یا زوج یا خاک لحد ستر مرداں حفظِ خویش از یارِ بد
 حرف بد را بر لب آوردن خطاست کافر و مومن ہمہ خلق خدا ست!
 آدمیت احترامِ آدمی باخبر شو از مقامِ آدمی!
 آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن بر طریقِ دوستی گامے بزن!
 بندۂ عشق از خدا گیرد طریق می شود بر کافر و مومن شفیق!
 کفر و دین را گیر در پہنائے دل دل اگر بگریزد از دل، وائے دل!
 گرچہ دل زندانی، آب و گل است

ایں ہمہ آفاق، آفاقِ دل است!

(1) بیٹے! بتاؤں دین کیا ہے۔ دین اللہ کی طلب میں خود کو جلانا ہے۔ اس کی انتہا عشق ہے اور اس کا آغاز ادب ہے۔

(2) دیکھو پھول کی آبرو اس کے رنگ اور خوشبو سے ہے۔ بے ادب درحقیقت بے

رنگ و بو اور بے آبرو ہوتا ہے۔

(3) میں جب کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو میرا دن میری رات کی طرح تاریک ہو جاتا ہے۔

(4) میرے سینے کا اضطراب بڑھ جاتا ہے اور نبی کریم ﷺ کا دور یاد آ جاتا ہے۔

(5) میں اپنے زمانے پر پچھتا تا ہوں کہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا جو بے ادب لوگوں کا زمانہ ہے۔ میں خود کو پرانی صدیوں میں چھپا لیتا ہوں، یعنی پرانے با ادب زمانے کی یاد میں کھو جاتا ہوں۔

(6) عورت کا ستر اس کا خاوند ہے یا اس کی قبر۔ مرد کا ستر خود کو بُرے دوستوں کی صحبت سے بچانا ہے۔

(7) بری بات کو ہونٹوں پر لانا خطا ہے۔ کافر اور مومن سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ سب سے محبت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

(8) آدمیت آدمی کے احترام کا نام ہے۔ تجھے آدمی کے مقام سے باخبر ہونا چاہئے۔

(9) آدمی تن بہ تن کے ربط و ضبط سے ہے، یعنی ایک آدمی کے دوسرے آدمی کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں، آدمیت اُس کا نام ہے۔

(10) بندہ عشق خدا سے مسلک (زندگی) لیتا ہے، یعنی جس طرح خدا سب پر مہربان ہے، اسی طرح بندہ عشق بھی کافر اور مومن دونوں پر مہربان ہوتا ہے۔

(11) کفر اور دین کو دل کی وسعت میں رکھ۔ ایک دل اگر دوسرے دل سے بھاگے تو ایسے دل پر افسوس ہے۔ یعنی قلب میں اتنی وسعت پیدا کر کہ وہ سب سے محبت کرے۔

(12) اگرچہ دل آب و گل (جسم) کے قید خانے میں ہے، مگر یہ ساری کائنات دل ہی کی کائنات ہے، یعنی دل بہت وسیع ہے۔ اس کو دوسروں سے نفرت کر کے تنگ نہ بنا۔

اس بند میں آدمی اور آدمی کے ربط و ضبط اور دوستی و شفقت کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ اس قابل ہیں کہ انہیں حرزِ جاں بنا کر قدم قدم پر اُن سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ اقبال کہتے ہیں کہ تُو انسان ہے، اس لئے ربط و ضبط اور باہمی تعلق کا آئین

اختیار کر کے دوستی کے راستے پر چل۔ عشق کے بندے اللہ کے راستے پر چلتے اور اپنی شفقت و محبت میں کافر و مومن کو یکساں حصہ دار بناتے ہیں۔ اس لئے اے فرزند! کفر اور دین دونوں کو اپنے قلب کشادہ میں جگہ دے۔ اے جانِ پدر! دل اگر دل سے بھاگے تو وہ ہرگز دل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دل آب و گل کا زندانی ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سارا دل کا جہان ہے۔

گیارہواں بند

گرچہ باشی از خداوندانِ ده فقر را از کف مدہ از کف مدہ
سوز او خوابیدہ در جانِ تو ہست این کہن مے از نیاگان تو ہست!
در جہاں جز دردِ دل ساماںِ خواہ نعمت از حق خواہ و از سلطانِ خواہ!
اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر می شود از کثرتِ نعمتِ ضریر!
کثرتِ نعمتِ گداز از دل برد ناز می آرد نیاز از دل برد!
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام نم بچشمِ منعمان کم دیدہ ام!
من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست!

(1) اگرچہ تو گاؤں کا مالک ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی فقر کو ہاتھ سے نہ دے، ہاتھ سے نہ دے۔

(2) فقر کا سوز تیری جان میں سویا ہوا ہے، یعنی تیرے اندر موجود ہے۔ یہ وہ پرانی شراب ہے جو تجھے تیرے بزرگوں نے عطا کی ہے۔ تیرے بڑے بھی سوزِ فقر رکھتے تھے۔ وہ سوزِ فقر تجھ میں بھی ہے۔

(3) جہاں میں دردِ دل کے سوا کسی اور سامان کی خواہش نہ کر۔ تو جو بھی نعمت چاہتا ہے وہ خدا سے مانگ، سلطان سے نہ مانگ۔ دردِ دل سے مراد ہے مخلوق کے دکھوں میں شریک ہونے والا دل۔

(4) بسا اوقات حق اندیش اور حق شناس لوگ نعمتوں کی کثرت کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں اور حق و ناحق میں تمیز نہیں کرتے۔

(5) نعمتوں کی کثرت دل سے گداز لے جاتی ہے۔ وہ ناز لے آتی ہے اور نیاز لے جاتی ہے۔

- (6) میں برسوں دنیا میں گھوما پھرا ہوں۔ میں نے دولت مندوں کی آنکھ میں نم نہیں دیکھا۔
 (7) میں اُس شخص کے قربان جس نے درویشانہ زندگی بسر کی۔ افسوس ہے اس شخص پر
 جو زندگی میں خدا سے غافل رہا۔

بار ہواں بند

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق آں یقین آں رنگ و بو آں ذوق و شوق!
 عالماں از علم قرآن بے نیاز صوفیاں در زندہ گرگ و مو دراز!
 گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست کو جو انمردے کہ صہبا در کدوست!
 ہم مسلمانانِ افرنگی مآب چشمہ کوثر بجویند از سراب!
 بے خبر از سز دین اند این ہمہ اہل کین اند اہل کین اند این ہمہ!
 خیر و خوبی بر خواص آمد حرام دیدہ ام صدق و صفا را در عوام!
 اہل دین را بازداں از اہل کین ہم نشین حق بجو با او نشین
 کرگساں را رسم و آئین دیگر است
 سطوت پرواز شاہیں دیگر است!

(1) آج کے دور میں مسلمانوں میں وہ ذوق و شوق، یقین اور رنگ و بو تلاش نہ کر، جو کبھی ان کے آباء و اجداد میں تھا۔

(2) آج کے علمائے دین قرآن کے علم سے بے نیاز ہیں جبکہ صوفی بھیڑیے اور بے بے بالوں والے ہیں۔ نہ علماء میں علم دین کی روح ہے اور نہ صوفیوں میں تصوف باقی ہے۔

(3) آج اگرچہ درویشوں کی خانقاہوں میں ہائے و ہو کا شور ہے، لیکن ایسا جواں مرد صوفی کہاں ہے کہ جس کے منکے میں تصوف کی شراب ہو۔ سب خالی خولی نعرے لگاتے ہیں۔

(4) مسلمان افرنگیوں سے متاثر ہیں۔ سراب میں سے چشمہ کوثر ڈھونڈتے ہیں، یعنی تقلید تو کافروں کی کر رہے ہیں اور توقع اسلامی فوائد کی کرتے ہیں۔

(5) یہ سب دین کے بھید سے بے خبر اور باہمی عداوت رکھنے والے یعنی اہل کینہ ہیں۔

(6) مسلمانوں کے زعماء میں کوئی خیر و خوبی نظر نہیں آتی۔ البتہ میں نے ان کے عوام میں ابھی تک صدق و صفا کو ضرور دیکھا ہے۔

(7) اہل دین کو کینہ و روں سے الگ رکھ۔ دونوں میں فرق کر۔ حق کے ہم نشین کی تلاش کر اور اس کے ساتھ بیٹھ۔ اس کی صحبت اختیار کر۔

(8) گدھوں کی رسم و دستور اور ہے جبکہ شاہینوں کی پرواز کی ہیبت اور ہے۔ دنیا کے طالب گدھ ہیں اور خدا کے طالب شاہین ہیں۔ گدھوں کو چھوڑ کر شاہینوں کی صحبت اختیار کر۔

غیر ہواں بند

مرد حق از آسماں افتد چو برق ہیزم او شہر و دشتِ غرب و شرق
ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات او شریکِ اہتمامِ کائنات
او کلیم و او مسیح و او خلیل و او محمد، او کتاب، او جبرئیل!
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل از شعاعِ او حیاتِ اہلِ دل
اول اندر نارِ خود سوزد ترا باز سلطانیِ پیاموزد ترا
ما ہمہ باسوزِ او صاحبِ دلیم ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم
ترسم این عصرے کہ تو زادی دراں در بدن غرق است و کم داندز جان!
چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود مرد حق در خویشمن پنہاں شود!
در نیابد جستجو آں مرد را گرچہ بیند روبرو آں مرد را!
گر مگر ذوقِ طلب از کف مدہ گرچہ درکارِ تو افتد صد گرہ!
گر نیابی صحبتِ مردِ نجیر از اب و جد آنچه من دارم بگیر!
بیر رومی را رفیقِ راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست پائے او محکم فتد در کوئے دوست!
شرح او کردند و او را کس ندید معنی او چوں غزال از ما رمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند چشم را از رقصِ جاں بر دوختند!
رقصِ تن در گردشِ آرد خاک را رقصِ جاں بر ہم زند افلاک را!
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست ہم زیں ہم آسماں آید بدست!
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم! ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم!
رقصِ جاں آموختنِ کارے بود غیر حق را سوختنِ کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر جاں برقص اندر نیاید اے پسر

ضعفِ ایماں است و دلگیری است غم نوجوانا! نیمہ پیری است غم!
 می شناسی؟ حرص فقر حاضر است من غلام آنکہ بر خود قاہر است
 اے مرا تسکین جانِ ناشکیب تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
 سرِ دین مصطفیٰ گویم ترا
 ہم بھر اندر دعا گویم ترا!

(1) اگر کوئی مردِ حق ہو تو اس کی شان یہ ہے کہ وہ آسمان سے بجلی کی طرح گرتا ہے۔ اس کا ایندھن شہرِ بیابان اور مشرق و مغرب کی ہر چیز ہوتی ہے۔ مردِ حق جب اللہ کی طرف سے دنیا پر مبعوث ہوتا ہے تو وہ باطل کے ایندھن کو اسی طرح جلا دیتا ہے جس طرح بجلی خرمین کو جلا دیتی ہے۔

(2) ہم ابھی تک کائنات کے اندھیروں میں ہیں اور وہ یعنی مردِ حق کائنات کے انتظام میں شامل و مشغول ہے۔

(3) وہ مردِ حق ہی خلیل ہے، مسیح ہے، کلیم ہے۔ وہ محمد ﷺ ہیں۔ وہ کتاب ہے۔ وہ جبریل ہے۔

(4) وہ اہلِ دل کی کائنات کا آفتاب ہے۔ اس کی شعاعوں سے اہلِ دل کی حیات ہے۔

(5) وہ یعنی مردِ حق پہلے تجھے اپنی آگ میں جلاتا ہے۔ پھر تجھے سلطانی سکھاتا ہے۔

(6) ہم سب اسی کے سوز سے صاحبِ دل ہیں ورنہ ہم آب و گل (مادہ) کے باطل نقش ہیں۔ مردِ حق کی صحبت سے آدمی دل والا یعنی صحیح آدمی بنتا ہے ورنہ وہ محض مٹی کا ایک مجسمہ ہے جو چل پھر رہا ہے۔

(7) میں اُس زمانے سے ڈرتا ہوں جس میں تو پیدا ہوا ہے کیونکہ یہ زمانہ بدن میں غرق ہے اور نہیں جانتا کہ جان کیا ہے۔ یہ تن پرستی کا زمانہ ہے۔ لوگ روح کو بھولے ہوئے ہیں۔ شکم پیش نظر ہے، دل پر دھیان نہیں۔

(8) جب روح کے قحط سے بدن سستا ہو جاتا ہے تو مردِ حق خود میں چھپ جاتا ہے یعنی وہ موجود تو ہوتا ہے لیکن لوگوں کی مادہ پرستانہ نگاہیں اُسے دیکھ نہیں سکتیں۔ اُسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔

(9) ایسے زمانے میں تلاش و جستجو بھی اس مردِ حق کو نہیں پاسکتی، اگرچہ نگاہیں اسے روبرو کیوں نہ دیکھ رہی ہوں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی پہچان نہیں ہوتی۔

(10) لیکن اے فرزند! تو ذوقِ طلب کو ہاتھ سے نہ دے، خواہ تیری راہ میں سو مشکلات آئیں۔

(11) اگر تو کسی مردِ خیر (خبر رکھنے والے) کی صحبت نہیں پاتا، تو جو کچھ میں نے اپنے آباء و اہلاد سے لیا ہے، تو وہ لے لے، وہ بھی تیرے لئے مردِ خیر کی صحبت کا کام دے گا۔

(12) پیرِ رومی کو راستے کا رفیق بنالے، تاکہ خدا تجھے عشق کا سوز و گداز عطا کرے۔

(13) کیونکہ رومی وہ مردِ حق ہے جو مغز کو چھلکے سے الگ کرتا ہے۔ اس کا پاؤں دوست کی گلی میں مضبوطی سے پڑتا ہے۔ وہ محرمِ اسرارِ دوست ہے۔ وہ حق و باطل کی تمیز جانتا ہے۔

(14) لوگوں نے مولانا رومی کی مثنوی کی شرح لکھی، لیکن رومی کو نہ دیکھا، یعنی اس کا راز نہ پایا۔ اُس کا فہم کیا تھا اور اس سے فیض کس طرح حاصل کرنا چاہئے، اس کے معنی ہم سے یوں بھاگے ہیں جیسے کہ ہرن بھاگتا ہے۔

(15) ہم نے اس کے کلام سے تن کا رقص سیکھ لیا اور آنکھوں کو جان کے رقص سے سی لیا، یعنی بند رکھا۔

(16) تن کا رقص مٹی (جسم) کو گردش میں لاتا ہے۔ جان کا رقص افلاک کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔

(17) روح کے رقص سے علم اور حکمت ہاتھ آتی ہے۔ زمین اور آسمان بھی ہاتھ آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ روح کے رقص سے صاحبِ رقص زمان و مکاں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

(18) روح کے رقص سے صاحبِ رقص حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کا جذب حاصل کر لیتا ہے۔ ملت اس سے ایک عظیم ملک کی وارث بن جاتی ہے، کیونکہ اس رقص سے اس میں بہت کے فیوض آ جاتے ہیں۔

(19) روح کا رقص سیکھنا آسان نہیں ہے۔ غیر حق کو جلانا آسان نہیں ہے۔

(20) جب تک آدمی کا جگر حرص اور غم کی آگ میں جلتا رہے گا، اے فرزند! روح رقص میں نہیں آئے گی۔

(21) غم دل گیری ہے ایمان کی کمزوری ہے۔ اے جوان! غم آدھا بڑھا پا ہے۔

(22) کیا تو جانتا ہے کہ حرص عہد حاضر کا فقر ہے؟ میں تو اس کا غلام ہوں جو خود پر قابو ہے یعنی جو اپنے حرص پر قابو پالیتا ہے۔

(23 اور 24) اے میری بے قرار جان کی تسکین اے میرے بیٹے! تو اگر روح کے رقص سے نصیب حاصل کر لے تو پھر میں تجھے دین مصطفیٰ ﷺ کا راز بتاؤں گا۔ میں قبر کے اندر بھی تیرے لئے دعا گور ہوں گا۔

اس بند کے آخری چند اشعار پیر رومی کو رفیق راہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں کہ سوز و گداز کی دولت بیدار صرف اسی طرح حاصل ہونی ممکن ہے۔ اقبال کو خداوندانِ مکتب اور اہل خانقاہ سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے حرفِ رومی کی تشریح تو کی، لیکن اس کی روح تک نہیں پہنچے اور اس لئے حقیقی معنی ہم سے یوں دور بھاگ گئے جیسے تیز روغزال۔ صوفیوں اور ملاؤں نے پیر رومی کے کلام سے رقصِ تن کا سبق تو اخذ کیا، لیکن رقصِ جاں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، حالانکہ رقصِ تن اور رقصِ جاں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک زمین کی گردش کا سبب بنتا ہے اور دوسرا افلاک کو برہم کرتا ہے۔ رقصِ جاں کی بدولت علم و حکمت اور زمین و آسمان پر تصرف حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ آدمی جب تک اپنے جگر کو حرص و غم کی آگ سے خاکستر نہ کر دے، جانِ رقص میں نہیں آتی۔

رقصِ جاں طبیعت کا وہ اضطراب ہے جس کی طرف اقبال اپنے کلام نثر و نظم میں بار بار اشارے کرتے رہے ہیں۔ موجودہ نسل کے نوجوانوں کو مستقبل کی زندگی کا امین اور پاسبان سمجھ کر وہ ساری زندگی یہ آرزو کرتے رہے ہیں کہ نوجوان کو اس مثالی انسان کا نمونہ بنائیں جو زمانے کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا رخ اس بہر زندگی کی طرف پھیر سکے جو خالقِ ازلی کا مقصود ہے۔ اقبال کے پاس بقول ان کے "صرف ایک بے چین اور مضطرب جان ہے"۔ ان کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ اپنا اضطراب کسی ایسے نوجوان کے دل میں منتقل کر دیں جو اس کا اہل ہو۔ اکبر الہ آبادی

کے نام ایک خط میں اقبال نے اپنی یہ آرزو ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:

”صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابلِ نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں“۔ (خط محررہ 25 اکتوبر 1915ء)

اسی اضطراب کا نام ”جاوید نامہ“ کی مذکورہ بالا نظم میں ”رقصِ جاں“ ہے اور اسی کو ”ارمغانِ حجاز“ میں ”تب و تاب“ کہا گیا ہے۔ یہی رقصِ جاں یہی تب و تاب اور اضطرابِ جاں ہے کہ اگر کسی نوجوان کے دل میں منتقل ہو جائے تو اقبال کے دل سے قبر میں بھی اس کے لئے دعائیں نکلیں گی۔ خود اقبال نے اپنی زندگی میں اس آرزو کو مناجات اور دعا کی صورت دی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاں یہ دعا زبان پر آئی ہے اس میں آرزو کی درد مندی نے بڑا سوز و گداز اور بڑی تاثیر پیدا کی ہے۔ یہ آرزو ان کی نظم ”ساقی نامہ“ میں بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کا پیکر اختیار کرتی ہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں! مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!
مرے نالہ نیم شب کا نیاز! مری خلوت و انجمن کا گداز!
امقئیں مری آرزوئیں مری امیدیں مری جستجوئیں مری!
مری فطرت آئینہ روزگار! غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات! گمانوں کے لشکر، یقین کا ثبات!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے! لٹا دے! ٹھکانے لگا دے! اسے!

علامہ اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں جو طویل نظم خطاب بہ جاوید (خنے بہ نژاد نو) کے عنوان سے تخلیق کی ہے اس کے فارسی متن کے ساتھ ہم نثر میں اردو ترجمہ اور پیش کر چکے ہیں۔ اس کا اردو میں منظوم ترجمہ جناب نظیر لدھیانوی نے کیا تھا۔ طلبہ کے مزید استفادے کے لئے یہ منظوم ترجمہ بھی یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

شاعری بے فائدہ ہے بالیقین دل میں جو ہے وہ اگر لب پر نہیں

گرچہ سو نکتے کئے میں نے بیاں
گر کہوں تو اور بھی پیچیدہ ہو
ایک نکتہ ہے کہ ہے اب تک نہاں
صورت اور الفاظ سے پوشیدہ ہو
یا تو تُو میری نظر میں دیکھ اُسے

یا مری آہِ سحر میں دیکھ اُسے

ماں نے ہے پہلا سبق تجھ کو دیا
تیرا غنچہ اس کے دامن میں کھلا
لفظ سے اس کے ہے تیرا رنگ و نُور
تو نے حرفِ لا الہ الا اللہ سے سنا
تجھ کو مالِ جاوداں اس سے ملا
اے پسرِ ذوقِ نگہ اب مجھ سے لے
لا الہ کہ روئے جاں سے اے جواں
مہر و مہ ہیں لا الہ سے دلِ فروز
ساز و سوزِ لا الہ اب مجھ سے لے
تا کہ آئے تن سے تیرے بوئے جاں
میں نے دیکھا کوہِ دک میں بھی یہ سوز
لا الہ کس نے کہا گفتار ہے
یہ تو اک شمشیرِ جوہردار ہے

جو جنے اس آگ میں قہار ہے

لا الہ کی ضرب بے زہار ہے

مومن اور پیشِ بشر باندھے نفاق
دین و ملت بیچے کوڑی کے عوض
لا الہ سے بے تہی اس کی نماز
نور سے بے بہرہ ہیں صوم و صلوة
ہائے تھا اللہ جس کا ساز و برگ
اب کہاں وہ مستی و ذوق اور وہ صبر
رنگِ لائی صحبتِ عصرِ جدید
ایک ایرانی ہے اک ہندی نژاد
جب جہاد و حج سے ہو منکر حیات
جب کہ بے جاں ہوں نمازیں اور صیام
قلب ہوں جب سوزِ قرآں سے تہی

خود سے مسلم ہو گیا دور اے خضر

المدد پانی گیا سر سے گزر

سجدہ وہ ہے ہو زمیں جس سے تپاں
سنگ اگر لے ایسے سجدے کا نشاں
عصر نو کیا ہے اسیری کے سوا
گر شکوہ رَبِّي الْأَعْلَى گیا
ہر کوئی ہے اپنی رہ پر تندرو
صاحبِ قرآن ہو بے ذوقِ طلب
العجب العجب! ثم العجب!

گر خدا تجھ کو کرے صاحبِ نظر
عقل ہے اس میں ٹرڈل بے گداز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل
وہ وطن خورشید کا وہ ایٹیا
قلب ہے بے وارداتِ نوبو
اس پرانے گھر میں اس کا روزگار
صیدِ ملا اور نچیرِ ملوک
عقل و دین و دانش و ناموس و تنگ
فکر پر کیا اس کے یورش بار بار
دل کو اپنے سینے
اس کے عالم کو

ہے بیانِ عصر نو دو حرف میں
حرفِ پیچیدہ ہے اور ہے نیش دار
حرفِ بیجاں میں ہے اندازِ فرنگ
اصل اس کی ذکر، اُس کی اصل فکر
آپ جو ہوں دو سمندر میری اصل

اک نیا انداز رکھتا تھا یہ دور

ڈالا میری طبع نے ہنگامہ اور

آنے والے دور کو دیکھ اے پسر!
آنکھ ہے بے شرم اور غرقِ مجاز
ہو رہے ہیں سب فدائے آب و گل
غیر ہیں ہے خود سے نا آشنا
اس کے حاصل کی ہے قیمت ایک جو
سرد ہے اور پڑسکوں مثلِ مزار
ہے غزالِ فکر اس کا ٹنگ و لوک
ہو رہے ہیں صیدِ عیارِ فرنگ
کر دیا ہر راز اس کا آشکارا!
میں خون کر دیا
دگرگوں کر دیا

گم کیا بحرین کو دو ظرف میں
تا کروں عقل و دلی حرداں شکار
نالہ مستانہ ہے اور تارِ چنگ
اے کہ تو ہو مایہ دارِ فکر و ذکر
فصل میری فصل ہے اور طرح وصل

نوجواں پیاسے ہیں اور خالی ایام
 کم نگاہ و بے یقین اور ناامید
 نوجواں ہیں منکرِ خود جو غیر
 اپنے مقصد سے ہے کتب بے خبر
 جاں سے اس نے نورِ فطرت دھو دیا
 نشتِ کج رکھتا ہے یہ معمارِ حال
 علم جب رکھتا نہیں سوزِ حیات
 علم ہے شرحِ مقاماتِ خودی
 چاہئے دل میں ہو پیدا نارِ حس
 علمِ حق اول حواسِ آخر حضور

اس کے آخر پر نہیں حاوی شعور

سو کتابوں کا سبق تو نے پڑھا
 لوگ اس ملنے سے جو رکھتی ہے نظر
 جس ہوئے صبح سے گل ہو چراغ
 تھوڑا کھا، کم بول، کم سو بالعموم
 حق سے ہے انکار کرنا کافری
 ذات کے انکار سے وہ ہے عجول
 شیوہٴ اخلاص کو کر اختیار
 عدل سے قہر و رضا میں کام لے
 حکم مشکل ہو تو تاویل میں نہ ڈھونڈ
 حفظِ جاں ہے ذکر و فکرِ بے حساب
 تو جہاں کا حکمراں ہے میرے شیر!
 سیر کی لذت ہے مقصودِ سفر
 ماہِ گردش میں ہے تا پائے مقام
 زندگی کو مائلِ پرواز رکھ

وہ سبق اچھا نظر سے جو ملا
 مست ہوتے ہیں باندازِ دگر
 لالہ اس بادِ بحر سے پڑایاغ
 گرد اپنے صورتِ پرکار گھوم
 ہے مگر انکارِ خود کافر تری
 یہ عجول و ظالم و کور و جہول
 دل سے گم کر خوفِ شاہ و شہریار
 قصد سے فقر و غنا میں کام لے
 اپنا ہی دل دیکھ قدلیں نہ ڈھونڈ
 حفظِ تن ہے ضبطِ دل وقتِ شباب
 حفظِ جان و تن سے یہ ہوتا ہے زیر
 تو نہ اڑا گر آشیاں پر ہے نظر
 جادۂ انساں میں ہے منزلِ حرام
 اس کی فطرت سے ہمیشہ ساز رکھ

رزق ہے زاغ و زغن کا گور میں

رزق شاہیں کا ہے ماہ و ہور میں

سز دیں ہے صدقِ قول، اکلِ حلال
راہ دیں میں سخت ہو الماس بن
سز دیں ہو جائے گا تجھ پر عیاں
تھا عمل کے حسن میں فردِ فرید
اسپ اپنا تھا بہت اس کو عزیز
اس کے آبا میں نچیانِ عرب
مردِ مومن کو عزیز اے نکتہ رس
کیا کہوں وصف اس کا وہ خیر الجیاد
روز بیجا تھا نظر سے تیزتر
اس کی رو میں افتنہ یوم النشور
ہو گیا اک دن وہ اسپ باد پا
دی دوا میں تے اے بیطار نے
پر سوار اس پر نہ پھر سلطان ہوا
اے جواں یہ ہے کمالِ اتقا

دیں ہے کیا؟ جلنا طلب میں روزِ دشب
آبرو گل کی ہے اس کا رنگ و یو
دیکھتا ہوں جب جواں بے ادب
دل میں ہوتا ہے فزوں جوشِ وداد
عہد سے اپنے بہت نالاں ہوں میں
سز زن ہے زوج یا خاکِ لحد
حرف بد کو لب پہ لانا ہے خطا
ہے شرافت احترامِ آدمی
آدمی کو ہے ضروری میلِ جول

انہا اس کی ہے عشقِ آغاز ادب
بے ادب بے رنگ و یو بے آبرو
دن مرا ہوتا ہے تیرہ مثلِ شب
مجھ کو عہدِ مصطفیٰ آتا ہے یاد
کاش عہدِ رفتہ میں پہاں ہوں میں
سز مرداں کیا ہے، ترکِ یارِ بد
کافر و مومن ہیں سب خلقِ خدا
تو سمجھ کیا ہے مقامِ آدمی
مہرباں ہو، دوستی کی راہ کھول

مردِ حق ہے اور یزداں کا طریق کفر و دین کو لے سر پہنائے دل
کافر و مومن پہ ہے یکساں شفیق! دل ہو گر دل سے گریزاں وائے دل

دل اگرچہ ہے اسیرِ آب و گل

یہ تمام آفاق ہے آفاقِ دل

ہو اگر قسمت سے شاہِ بحر و بر تو کسی صورت نہ ترکِ فقیر کر

سوز اس کا خفتہ تیری جاں میں ہے تیرے آبا سے ہے یہ دیرینہ سے

کچھ سوائے دردِ دوراں سے نہ مانگ حق سے نعمت مانگ سلطاں سے نہ مانگ!

ہیں بہت مردِ حق اندیش و بصیر ہو گئے جو فرطِ نعمت سے ضریر!

ساہبا کی سیر مثلِ آفتاب منعموں کی آنکھ میں دیکھا نہ آب

اس پہ قرباں جو ہے درویشیِ اساس

وائے وہ دل جو ہے یزداں ناشناس

ڈھونڈ مسلم میں نہ تو وہ سوز و شوق وہ یقیں وہ رنگ و بو وہ درد و ذوق

علمِ قرآن سے ہیں عالمِ بے نیاز اور صوفیِ گرگِ خونی، مو دراز

خانقاہوں میں ہے گرچہ ہا و ہو ہے مئے حق سے مگر خالی سبُو

یہ مسلمانانِ افرنگی مآب سمجھے ہیں کوثرِ اسے جو ہے سراب

ناشناسِ سزِ دین ہیں سب کے سب لہلہ کیں ہیں لہلہ کیں ہیں سب کے سب

خواص میں ہے خیر اور خوبیِ حرام بہرہ و رصدق و صفا سے ہیں عوام

کر تمیزِ اہلِ دین و اہلِ کیں ہم نشینِ حق کا ہو تو ہم نشین

کرکوں کا رسم و آئیں اور ہے

سطوتِ پروازِ شاہیں اور ہے

مردِ حق کا وار ہے ماتہِ برق اس کا ایندھن شہر و دشتِ غرب و شرق

ہم ہیں محصورِ ظلامِ کائنات وہ شریکِ اہتمامِ کائنات

وہ کلیم اور وہ میجا، وہ خلیل وہ محمد، وہ کتاب اور جبرئیل

وہ ہے مہرِ کائناتِ اہلِ دل اس کی ضو سے ہے حیاتِ اہلِ دل

اپنی آتش میں جلائے گی تجھے پھر شہی کے گر سکھائے گی تجھے

سوز سے اس کے ہی صاحب دل ہیں ہم
 یہ زمانہ جس میں تُو پیدا ہوا
 جب بدن ارزاں ہوں اور ہو قحطِ جاں
 کارگر ہوتی نہیں ہے جستجو
 تو مگر ہر آن رکھ ذوقِ طلب
 گر نہ تجھ کو قربِ مردِ حق ملے
 پیرِ رومی کو رفیقِ رہ بنا
 ہے اسے معلوم فرقِ مغز و پوست
 ہوں معافی اس کے کیونکر دل نشیں
 مثنوی ہے رقصِ تن حاصل کیا
 رقصِ تن گردش میں لائے خاک کو
 علم و حکم آتے ہیں رقصِ جاں سے ہاتھ
 فرد اس سے صاحبِ جذبِ کلیم
 رقصِ جاں کا سیکھنا اک کام ہے
 حرص اور غم کا اگر ہے دل میں گھر
 ضعفِ ایمانی ہے دل گیری ہے غم
 حرصِ غافل فقرِ حاضر کا ہے نام
 ہو سکونِ جاوداں سے بہرہ ور

جان لے اسرارِ دینِ مصطفیٰ

قبر میں بھی میں تجھے دوں گا دُعا

کلام منشور

اقبال زرے شاعر یا زرے فلسفی نہ تھے۔ وہ مصلح بھی تھے۔ سیاسی رہنما بھی تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر تھے۔ پنجاب صوبائی اسمبلی کے منتخب رکن بھی رہے۔ قائد اعظم کو اپنا قائد سمجھتے تھے۔ گول میز کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے۔ سیاسی بیانات و اعلانات جاری کرتے تھے۔ پریس کانفرنس کرتے تھے۔ مشاہیر سے خط و کتابت کرتے تھے۔ سیاسی، ادبی و ثقافتی انجمنوں کی صدارت کرتے تھے جہاں تقریریں کرتے۔ مدراس میں الہیات اسلامیہ پر چھ لیکچر دیئے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

ان کی تقریروں، تحریروں، بیانات، اعلانات اور خطوط میں ان کے عقائد و افکار نثر کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ نوجوان نسل کے تعلق سے ان کے شاہکار نثر پاروں کا انتخاب یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

اگلے مسلمانوں کا نصب العین

اسلام کی تاریخ دیکھو۔ وہ کیا کہتی ہے؟ عرب کے خطے کو یورپین معماروں نے ردی اور بے کار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیا اور یورپ کی تو میں عرب سے نفرت کرتی تھیں، مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا، تو یہی پتھر دنیا کے ایوان تمدن کی محراب کی کلید بن گیا اور خدا کی قسم، روما جیسی باجروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اُس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے خدا، اپنے رسول، اپنے دین اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھ کر حاکموں سے مودبانہ حاجات طلب کریں اور بنی نوع انسان میں امن و امان قائم رکھیں، کیونکہ اسلام ہمیں شر و فساد کی

ممانعت کرتا ہے۔ ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر باقی اقوام سے ربط و اتحاد بڑھائیں اور جو سیکھے سکتے ہیں، انہیں سکھائیں۔ جو سکھا سکتے ہیں، ان سے سیکھیں، اور حتیٰ الوسع ہمارا وہ نصب العین ہو جو اگلے مسلمانوں کا تھا۔

(جلسہ عام بیرون موچی دروازہ لاہور: یکم فروری 1912ء)

اسلام میں جبری تعلیم

اس جلسے میں مسٹر گوکھے کے تعلیمی بل کے جبریہ پہلو پر غور ہوگا۔ لفظ جبر سے کسی کو کھٹکا نہ ہونا چاہئے۔ جس طرح چچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے اسی طرح جبریہ تعلیم بھی قابل اعتراض متصور نہیں ہو سکتی۔ جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چچک کا ٹیکہ ہے۔ اسلام میں جبریہ تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔

(جلسہ اسلامیہ کالج لاہور: 18 فروری 1912ء)

اسلام اور اشتراکیت

میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی یا شورزم یورپ کی نا عاقبت، اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی یا شورزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں..... مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے

پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول سیاسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا اس سے ملتے جلتے ہوں گے۔

(مکتوب بنام روزنامہ ”زمیندار“ لاہور: 24 جون 1923ء)

قلب کی فطرت

مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا۔ راتیں غور و فکر میں گزار دیں تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کاربند ہو کر عرب حضور سرور کائنات ﷺ کی صحبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے کاش ہر مسلمان کے دل میں بھی بیٹھ جائے۔ نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے اس لئے کہ طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی نظر مختلف ہے۔ اسلوب فکر مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہئے جس طرح کہ ہمارے آباء و اجداد نے اسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے۔ جب لوگوں میں تنگ نظری آ جاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ اختلاف بھی کرو تو اپنے آباء کی طرح۔ تنگ نظری چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مخالف کو بھی نرمی سے سمجھاؤ۔ قلب کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ محبت سے رام ہو سکتا ہے مخالفت اور عداوت سے نہیں۔

(انتخابات کے سلسلے میں ایک تقریر لاہور: 19 نومبر 1926ء)

مذہب اور سائنس کا تعلق

مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے

طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

قرآن کریم کے ہر صفحے پر انسان کو مشاہدے اور تجربے کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور منتہائے نظر یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مسلمانوں میں فرقہ معزولہ اور دیگر فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہوا تھا وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے روشن دماغ علما اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا ہوا بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلام ربانی کو عقل انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔

(جلسہ اسلامیہ کالج لاہور: 4 مارچ 1927ء)

فنا فی اللہ بھی نہیں

حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت 36 میں آیا ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ

وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝﴾

”اور ایسی بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تجھے علم نہیں کیونکہ بے شک تمہارے

کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال ہوگا۔“

اس آیت میں حصول علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع و بصر ہے

اور دوسرا ذریعہ انسان کا قلب ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ سمع و بصر کو چھوڑ کر کلی طور پر قلب کی طرف

متوجہ ہو جاؤ اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر یورپ والوں کی طرح بالکل سمع و بصر کے

ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات قلب پر مرکوز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا۔

نظام عالم کی آفرینش یوں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نمونہ کے لئے یا اپنے آپ کو

ظاہر و نمایاں کرنے کے لئے دنیا کو پیدا کیا۔ اس خط سفر کا آخری نقطہ عالم ظاہر ہے۔

اب حقیقت تک پہنچنے کی راہ یہ ہے کہ اس آخری نقطے سے الٹا سفر کیا جائے۔ دوسرا

طریقہ یہ ہے کہ مظاہر کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہ ہونا چاہئے کہ انسان مشاہدہ حقیقت کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ اسلامی نقطہ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدہ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے، لیکن تہمید و سرکشی کے لئے نہیں بلکہ خدمت و عبودیت کے لئے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہئے، گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔

(انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس: 20 اپریل 1927ء)

ہندوؤں کی ذہنیت

میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں۔ تعلیم میں پسماندہ ہیں۔ ویسے بھی بڑے بھولے بھالے ہیں۔ حکومت چکنی چڑی باتیں کر کے انہیں آسانی سے پھسلا لیتی ہیں، ہندو انہیں پھسلا لیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے۔

(جداگانہ طریق انتخاب کے حق میں صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر: یکم مئی 1927ء)

تحریر کی آزادی

ذاتی طور پر میں اخبارات کی آزادی کا بہت بڑی حد تک قائل ہوں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آزادی کا حامی ہوں، لیکن میں دلائل سے متاثر نہیں ہو سکتا اور آزادی اور لائسنس کو یکساں نہیں سمجھ سکتا۔ حقیقی آزادی اخلاقی ضبط نفس کا نتیجہ ہوا کرتی ہے..... اگر دیسی اخبارات سنسنی پھیلانے والے عنوان لکھنا چھوڑ دیں، تقریروں وغیرہ کی رپورٹ کرنے کے لئے بہتر آدمی رکھیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جو کسی اور طریقے کی معاشرت میں جاذب توجہ نہیں ہو سکتے، فرقہ وارانہ رنگ دینے سے احتراز کرنے لگیں تو دیسی زبانوں کے اخبارات کی تعلیمی قدر و قیمت بہت بڑھ سکتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں عام اشخاص نقاد نہیں اور سطحی عقل رکھنے والے ہیں، ایسی احتیاط نہایت ضروری ہے۔ بہر حال اس اعلان کا مقصد اخبارات

کے لب و لہجے کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ اُن کی آزادی کا سلب نہیں۔

(”مسلم آؤٹ لک“ سے انٹرویو: 23 مئی 1927ء)

اُمت مسلمہ کا اجتماع

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے لئے جو راہِ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے..... آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو اُن کو فوری طور پر اپنی اصلاح و ترقی کے لئے سعی و کوشش کرنی چاہئے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں آباد ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے..... آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولوشن پیش ہوا ہے وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لئے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔

(آل پارٹیز مسلم کانفرنس، دہلی: یکم جنوری 1929ء)

ہم مسلمانوں کو چاہئے کہ فقہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جو حقوق ملتِ اسلامیہ نے عورتوں کو دیئے ہیں وہ اُن کے حصول پر اصرار کریں۔ شوہر باپ بھائی کون سیاہ دل مرد ہوگا جو آپ کو آپ کے حقوق دینے سے انکار کرے گا۔ ہمیں تو ملک میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کی رائے عامہ پیدا کرنی چاہئے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آئندہ (شادی شدہ) زندگی میں عورتوں کے کون کون سے حقوق ہوں گے، اس وقت تک نکاح نہ پڑھایا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہئے۔ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں اور ترکی یاد دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے

نہ ہو جائیں۔

(انجمن حمایت اسلام مدراس: 7 جنوری 1929ء)

قدامت پسند اور ترقی پسند

اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام میں قدامت پسند جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پرست اسلام جدوجہد کے بغیر سر تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لئے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہئے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں، بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملتوی کر دینا چاہئے، کیونکہ صرف ضروری چیزیں فی الوقت قابل لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر ارتقاء کی منزل طے کرتی ہے۔ انسان نے اپنی معاشرتی تہذیب کو تشکیل دینے کا سبق حال ہی میں سیکھا ہے، اس لئے جائز حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

(افغانستان پر بچہ سہہ کے قبضے کے خلاف انٹرویو: 26 فروری 1929ء)

دیوارِ گریہ کی حقیقت

فلسطین میں مسلمان اور ان کے بیوی بچے شہید کئے جا رہے ہیں۔ اس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ اس مسجد کا تعلق حضرت خواجہ دو جہاں رحمۃ اللہ علیہ کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے، جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے..... صدیاں گزر گئیں کہ ایک معبد تیار ہوا تھا، جسے ”ہیکل سلیمانی“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا ذکر حضرت عمر فاروق سے فرمایا تو انہیں ہیکل یا مسجد اقصیٰ کے صحیح موقع و محل سے بھی مطلع کر

دیا۔ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس یروشلم تشریف لے گئے تو انہوں نے مسامحہ شدہ ”ہیبر سلیمانی“ کا محل وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی۔ اُس وقت وہاں گھوڑوں کی لید جمع تھی جسے انہوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک ہو گیا۔ پھر اس جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جس کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔ یہود و نصاریٰ کا تاریخ میں تو یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ موجودہ مسجد اقصیٰ اسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہیرا سلیمانی واقع تھا۔ اس شخص کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس کی زیارت کے لئے اس وقت آنا شروع کیا جبکہ یہ شخص ہو چکی تھی۔

ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انہیں مخصوص اوقات میں دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اس دیوار کا نام ان کی اصطلاح میں ”دیوارِ گریہ“ مشہور ہو گیا۔ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے مسجد اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس قبضے اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں، قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انہیں ہرگز نہیں پہنچتا، سوائے اس کے کہ ترکوں نے انہیں گریہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

(یومِ فلسطین پر صدارتی خطبہ لاہور: 7 ستمبر 1929ء)

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب

عزیز طلبہ! ممکن ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ میں آپ کے پاس نامے کے جواب میں ایک ناصح مشفق کی طرح آپ کو کوئی نصیحت کرنے یا بعض نکاتِ حکمت پیش کرنے لگوں گا، لیکن آپ سے فوراً اور صاف کہے دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کی ہندو نصیحت کچھ نہیں، اور نہ میرے پاس کوئی نکتہ حکمت ایسا ہے جو دوسروں کے لئے بطور

بلکہ میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ اور خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں وہاں سے بہت سی چیزیں ہم تک پہنچی ہیں۔ سب سے اول چیز انگریزی لٹریچر ہے جو ہمارے بہت سے نوجوان مصنفین کے لئے تخلیق مضامین کا ذریعہ ہوا ہے۔ وہ مضامین جنہوں نے موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ دوسری بات جو ہم کو انگلستان سے ملی ہے وہ افکار کی عادت ہے۔ میرے نزدیک یہ عادت اس ملک کے لئے بہترین نعمت ہے جس نے واقعات کے خلاف آنکھیں بند کر لی ہیں اور مسلسل طور پر محض خیال آرائیوں سے کام لیتا رہا ہے۔ الغرض فکرِ ثقیل کی عادت ہم کو انگلستان سے ملی ہے اور درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے جس کا نام ”ڈیموکریسی“ ہے۔ جس صورت میں یہ ”ڈیموکریسی“ آچکی ہے اور جو بمقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی۔ ذاتی طور پر میں اس ”ڈیموکریسی“ کا معتقد نہیں ہوں اور اسے محض اس لئے گوارا کر لیتا ہوں کہ فی الحال اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ مگر خیر اب چونکہ یہ ”ڈیموکریسی“ انگلستان سے آچکی ہے اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ موجودہ نسل نوجوانان کے لئے یہ کس قدر مفید ہے۔ واضح ہو کہ ”ڈیموکریسی“ کے معنی صاف، علی رؤس الاشہاد اور آزادیِ بحث و تمحیص ہیں۔

ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں، مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لئے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمہ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لئے ہم

علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔ اس طریقہ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس ^{مطمئن} حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کر دے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گزشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسیدِ خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لئے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔

(اجلاس مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین: 29 نومبر 1929ء)

قوم پرستی کا مفہوم

پہلے معلوم کرنا چاہئے کہ قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ نیشنلزم کا جو تجربہ یورپ میں ہوا اس کا نتیجہ بے دینی اور لاندہی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ وہی ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ رسول عربی ﷺ کا وہ حکم موجود ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل ذات پات اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے چکھتا ہوں۔ تم سب مسلمان ہو اور یہی تمہارا صحیح نام ہے۔ ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں اس لئے مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ مسلمان دوسروں پر حکومت نہیں چاہتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان پر حکمران ہوں اور وہ ان کے غلام بنے رہیں۔ مسلمان نوجوانوں کو چاہئے کہ سب سے زیادہ قربانی کرنے کو تیار رہیں۔

مسلم نوجوانوں کو چاہئے کہ منظم ہو جائیں اور یہ کوششیں اس لئے ہیں کہ آپ گوٹڈ اور بھیل نہ بن جائیں۔ ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں کرنی ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ اس کے لئے بھی ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دست گیری کرے گا تو وہ بد بخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو۔

(جلسہ عام بیرون موچی دروازہ لاہور: 2 مئی 1931ء)

یوم کشمیر پر اپیل

مسلمانو! پے در پے حملے کر کے تمہارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مردہ قوم ہے۔ اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے آپ کا یہ فرض ہے کہ ”یوم کشمیر“ کو کامیاب بنائیں اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ (مسلمان کشمیر پر مظالم کے خلاف: 14 اگست 1931ء)

نوجوانوں کو نصیحت

گزشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لہذا اب اگر لندن (گول میز کانفرنس) میں بھی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکلی اور کھل ”پراونشل اتانومی“ نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا تو مسلمان ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی قربان کرنا پڑے گی اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا، مسلمان ہند اس کے پر نچے اڑادیں گے۔

سارے ہندوؤں کے نوجوانوں کو اپنا جانشینا کے لئے تیار کرنے کا کام صیاحا ہے

تھا ہرگز نہیں کیا۔ لہذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کے لئے تیار رہیں جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینی ہوں گی۔

(دہلی صوبہ مسلم کانفرنس: 9 ستمبر 1931ء)

اسلام کے اندرونی دشمن

اسلام کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اس الحاد اور مادیت کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کر سکتی جو یورپ سے نشر و اشاعت حاصل کر رہا ہے۔ مجھے اسلام کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں سے ہے۔

(مؤتمر عالم اسلامی، یروشلم: 4 دسمبر 1931ء)

جاوید اقبال کے نام مکتوب

میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس مسجد کے دیکھنے کے لئے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو! (9 فروری 1932ء)

☆ رات کے تارے جو اپنی چمک دمک کے لئے تاریکی کے محتاج ہیں اور جو محض روشنی کی چنگاریاں ہیں ان کی عمر اس قدر لمبی ہے کہ انسانی عقل اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر انسان جو قدرت کا روشن ترین ستارہ ہے کیا ایک عارضی زندگی رکھتا ہے اور روشنی کی آسمانی چنگاریوں سے بھی گیارا ہے؟ نہیں اس کی عمر ستاروں کی عمر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والا چراغ ہے۔ (روزگار فقیر)

☆ آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے فنا کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گزر جانے کا اثر نہیں بلکہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ اس لطیف احساس کی وجہ سے ہمارا غم دور ہو جاتا ہے۔ بس گزرے

ہوئے عزیزوں کی طرف سے بے پروائی اور گونہ غفلت روح کے اس احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں۔ اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔ (روزگار فقیر)

☆ زندگی میں کامیابی کا انحصار عزم پر ہے نہ کہ عقل پر! (شذرات)
 ☆ پندار کی تسکین میں ہمارے لئے ایک معاشی پہلو بھی ہے۔ آپ مجھے ”ہسپتال اسٹنٹ“ کے بجائے ”سب اسٹنٹ سرجن“ کہیں تو میں بالکل مطمئن ہو جاؤں گا، خواہ آپ میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ کریں۔ (شذرات)
 ☆ بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سخاوت اور اپنی روایات و قوت پر جائز فخر ایسی چیزیں ہیں جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔ (شذرات)

☆ کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین و محافظ عورت ہوتی ہے۔ (شذرات)
 ☆ اپنی حدود کو پہچاننے اور اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے۔ پھر زندگی میں آپ کی کامیابی یقیناً ہے۔ (شذرات)

☆ تو میں شعراء کے دلوں میں جنم لیتی ہیں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں پلتی ہیں اور مرجاتی ہیں۔ (شذرات)

☆ ضبط نفس افراد میں ہو تو خاندانوں کی تعمیر ہوتی ہے، قوموں میں ہو تو سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ (شذرات)

☆ محبت اکیر سے بڑھ کر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکیر ادنیٰ دھاتوں کو سونا بنا دیتی ہے، لیکن محبت تمام سفلی جذبات کو خود اپنے پاکیزہ وجود میں تبدیل کر دیتی ہے۔ (شذرات)
 ☆ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے۔ (حرف اقبال)

☆ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (حرف اقبال)

☆ ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ (حرف اقبال)
 ☆ اسلام میں نماز باجماعت حصول معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں، اس کی قدر و قیمت کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ (خطبات)

☆ اگر ہم چاہتے ہیں کہ عبادت کا مقصد زیادہ کامیابی سے حاصل ہو سکے تو اس کی ایک

یہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اسے اجتماعی شکل دیں۔ (خطبات)
☆ قرآن مجید کے نزدیک تو انسان ہونا نام ہی اس بات کا ہے کہ ہر قسم کی سختیاں اور مصائب برداشت کئے جائیں۔ (خطبات)

☆ علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ (خطبات)

☆ قرآن مجید کی رُو سے کائنات میں اضافہ ممکن ہے۔ (خطبات)

☆ زندگی کا راستہ موت درموت سے گزرتا ہے۔ (خطبات)

☆ اگر انسان پہل نہیں کرتا اپنی ذات کی وسعتوں اور گونا گوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں

دیتا زندگی کی بڑھتی ہوئی رُو کا کوئی تقاضا اپنے اندرون ذات میں محسوس نہیں کرتا

تو اس کی رُو پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے اور وہ گر کر بے جان مادے کی سطح پر جا

پہنچتا ہے۔ (خطبات)

☆ انسانی سیرت کا تقاضا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرے اس میں سختی اور پختگی پیدا ہوتی

جائے۔ (خطبات)

☆ تغیر و تبدل وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت

ٹھہرایا ہے۔ (خطبات)

☆ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور ست تاروں کا بنا ہوا ایک

ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول صرف اسلام ہی نے بتائے ہیں جن کی پختگی

اور پائیداری ضروریام سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ (مکاتیب، اقبال)

☆ آزر دگی اور پریشاں خاطر ی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ اسلام کی حقیقت فقر

ہے۔ (مکتوبات اقبال)

☆ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے شور و غوغا میں آپ کی آواز سنی جائے تو آپ کی

روح پر محض ایک ہی خیال کا غلبہ ہونا چاہئے۔ مقصد واحد کی لگن والا شخص ہی سیاسی

اور معاشرتی انقلابات پیدا کرتا ہے، سلطنتیں قائم کرتا ہے اور دنیا کو آئین عطا کرتا

ہے۔ (شذرات)

☆ خدا اور شیطان دونوں انسان کو صرف مواقع فراہم کرتے ہیں اور یہ اسی پر چھوڑ

دیتے ہیں کہ وہ ان مواقع سے جیسا مناسب سمجھے فائدہ اٹھائے۔ (شذرات)

☆ راوی کے کنارے غروب آفتاب کے ایک پُر اجلال منظر کے مقابلے میں آپ کے کتب خانے کا سارا حیرت انگیز کتابی علم و دانش ہیچ ہے۔ (شذرات)

☆ اگر آپ ایک بڑے کتب خانے کے مالک ہیں اور اس کی ساری کتابیں آپ کے علم میں ہیں تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ امیر ہیں، یہ ضروری نہیں کہ آپ مفکر بھی ہوں۔ آپ کے بڑے کتب خانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ بہت سے آدمیوں کی فکری خدمات حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ (شذرات)

☆ ریاضی کے ایک خط میں اتنی رسائی ممکن نہیں لیکن شاعر کا ایک خط مصرع لامحدودیت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ (شذرات)

☆ اسلام اور عیسائیت دونوں کو ایک مشترک حریف یعنی بت پرستی سے پنپنا پڑا، لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے حریف سے سمجھوتہ کر لیا جبکہ اسلام نے اسے بالکل نیست و نابود کر دیا۔ (شذرات)

☆ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک توانائی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے جبکہ ترک دنیا اور رہبانیت موجب تسکین۔ (اقبال نامہ)

☆ سیاست مسلمانوں میں کوئی علیحدہ شے نہیں، بلکہ خالص مذہبی نکتہ خیال سے کچھ شے بھی نہیں۔ اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لونڈی ہے۔ (مکاتیب اقبال)

☆ میں اُس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں، جس گھر میں علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے۔ (گفتار اقبال)

☆ کوئی قوم، قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ ابتلاؤں میں گرفتار نہ ہو۔ (گفتار اقبال)

☆ اگر میری روح کے عمیق ترین خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں اور وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں، کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور آنسوؤں کی شکل میں خراج تحسین ادا کرے گی۔ (اقبال از عطیہ بیگم)

اقبال کے خطوط بنام قائد اعظم

”آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ نئے دستور نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کم از کم اس بات کا نادر موقع دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیا کی آئندہ سیاسی ترقی کے پیش نظر اپنی قومی تنظیم کر سکیں گے۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں، تاہم ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے، اس لئے میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دیا جائے۔ آپ جلد از جلد دہلی میں ایک ”آل انڈیا مسلم کنونشن“ منعقد کریں، جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں کہ سیاسی سطح نظر کی حیثیت سے مسلمانان ہند ملک میں جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ اندرون اور بیرون ہند کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تھا ایک مسئلہ نہیں ہے، اسلامی نقطہ نظر سے ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے اور کسی صورت سے بھی یہ اقتصادی مسئلہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر آپ ایسا کنونشن منعقد کر سکیں تو پھر ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی حیثیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا، جنہوں نے مسلمانان ہند کی امنگوں اور مقاصد کے خلاف جماعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ مزید برآں اس سے ہندوؤں پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی سیاسی حربہ خواہ کیسا ہی عیارانہ کیوں نہ ہو، پھر بھی مسلمانان ہند اپنے ثقافتی وجود کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ (20 مارچ 1937ء)

”اسلامی قانون کے طویل اور عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لئے کم از کم حق

معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعتِ اسلام کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میرا ایمان ہے کہ مسلمانوں کی غربت (روٹی کا مسئلہ) اور ہندوستان میں امن و امان کا قیام اسی سے حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے تو پھر دوسرا متبادل (راستہ) صرف خانہ جنگی ہے جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین (کی داستان) دہرائی جائے گی۔ جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کا ہندوؤں کی بہت سیاسی کے ساتھ پیوند بھی خود ہندوؤں کے آپس میں خون خرابے کا باعث ہوگا۔ اشتراکی جمہوریت اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا یا نہیں؟ میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا، لیکن میرے ذہن میں یہ بات صاف ہے کہ اگر ہندو دھرم اشتراکی جمہوریت اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں اور اسلام کے اصولِ شریعت کے ساتھ اختیار کر لینا کوئی انقلاب نہیں، بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع ہوگا۔ موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے، لیکن جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، مسلم ہندوستان کے ان مسائل کا حل آسانی سے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کو ایک یا زیادہ مسلم ریاستوں میں تقسیم کیا جائے، جہاں پر مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت نہیں آ پہنچا۔ شاید جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ ایک بہترین جواب ہے۔“ (28 مئی 1937ء)

”میرے خیال میں تو نئے دستور میں ہندوستان بھر کو ایک ہی وفاق میں مربوط رکھنے کی تجویز بالکل بیکار ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق کا قیام صرف واحد

راستہ ہے، جس سے ہندوستان میں امن و امان قائم ہوگا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچایا جاسکے گا، کیوں نہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام تصور کیا جائے، جن کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری حاصل ہو۔ (21 جون 1937ء)

جہاں تک پنجاب کی صورت حال کا تعلق ہے:

(1) شہید گنج کے متعلق غالباً پر یوی کونسل میں اپیل کی جائے گی، لیکن لوگوں کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں، کیونکہ اس وقت وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ کسی برطانوی عدالت کی طرف رجوع بے سود ہے۔

(2) ملک برکت علی نے تحفظ مساجد کے متعلق پنجاب اسمبلی میں جو بل پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے، مسلمانوں میں اس پر کافی جوش پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت تک یونینسٹ پارٹی کے 25 ارکان نے سرسکندر حیات کی ہدایات کے برعکس اخبارات میں اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس بل کی تائید کریں گے اور اس بل کو انہوں نے اپنا بل بنا لیا ہے۔ نیز صوبے کے تمام ووٹر مناسب قراردادیں منظور کر کے اپنے اپنے نمائندوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس بل کی پوری حمایت کی جائے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ جب یہ بل منظوری کی غرض سے اسمبلی میں پیش ہوگا تو قانون کی صورت اختیار کر لے گا۔

(3) شہید گنج کی سول نافرمانی کی تحریک، روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے۔ عوام پر امن ہیں اور بے تابی سے آل انڈیا مسلم لیگ کے خصوصی اجلاس کے اہم فیصلوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو پنجاب کے تقریباً تمام مسلم ادارے، ”مسلم لیگ“ کی رہنمائی میں سرگرم نظر آئیں گے۔ پنجاب صوبائی مسلم لیگ آپ کو یقین دلاتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے لئے تمام ضروری انتظامات کرنے کی ذمہ دار ہے۔ (7 مارچ 1938ء۔ وفات سے ڈیڑھ ماہ قبل)

